خوفناک
کتا
اشتیاق احمد

محمود، فاروق، فرزانہ اور
انسپکٹر جمشید کے کارنامے ۲۰

خوفناک کتا

اشتیاق احمد

بار دوم:
تعداد: — ایک ہزار
قیمت: — ۵/ روپے
ناشر: مکتبہ اقرا، ۸۰ میکلوڈ روڈ لاہور
طابع: البدر پرنٹرز۔ لاہور

دو باتیں

اشتیاق احمد صاحب کا مکتبہ اقرا، کی طرف انسپکٹر جمشید کے کارنامے کے سلسلہ میں یہ آخری اور بیسواں ناول ہے۔ اس سے قبل آپ ہمارے ادارہ کی طرف سے اُن کے اُنیس ناول پڑھ چکے ہیں، لہٰذا اب کی بار اُن کی بجائے میری دو باتیں سُن لیں۔

ہم نے اب آپ کی تفریح اور دلچسپی کے لیے ایک نیا اور بہت ہی دلچسپ سلسلہ "مراد، ریٹائرڈ انسپکٹر رضوی اور موتی کے کارنامے" کے نام سے شروع کیا ہے۔ اس سلسلہ کے اب تک آٹھ ناول شائع ہو چکے ہیں

(۱) قتل کی رات (۲) قاتلوں کا تعاقب (۳) خطرناک راہیں
(۴) انصاف کا دن (۵) لکڑی کی چابی (۶) مکھی کا قتل
(۷) نیلی آنکھیں (۸) زندہ قبر

اور ہم ہر ماہ دو ناول اس سلسلہ کے شائع کیا کریں گے۔

ننھے ساتھیو! آپ نے بڑی اچھی اچھی کتابیں پڑھی ہیں۔ یہ نیا سلسلہ جو ہم نے آپ کے لیے شروع کیا ہے اس میں ایک کردار "موتی" کا ہے جو آپ کے لیے بڑے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دے رہا ہے جسے آپ مدتوں فراموش نہ کر سکیں گے۔

جلال انور

ترتیب

سرخ نشان

محمود اور فاروق نیشنل پارک میں پتھر کے بنچ کی بجائے گھاس پر بیٹھے تھے۔ انہیں گھاس پر بیٹھنا زیادہ پسند تھا۔ ان کے نزدیک ہی ایک موٹا تازہ آدمی ہاتھ میں رومال پکڑے بیٹھا تھا۔ وہ باغ میں ٹہلنے والوں کو غور سے دیکھ رہا تھا جیسے کسی کی تلاش ہو۔ دونوں نے اس کی طرف ایک دو بار دیکھا تھا اور پھر اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ موٹا آدمی سانولے رنگ کا تھا اور جتنا اس کا جسم بڑا تھا، آنکھیں اتنی ہی چھوٹی تھیں۔ ناک ذرا موٹا اور ہونٹ پتلے تھے۔ اس کی ٹھوڑی کے عین اُوپر تین کونوں والا ایک سُرخ نشان تھا جیسے مثلث۔ پہلی نظر میں محمود اور فاروق کو یہ نشان مصنوعی نظر آیا تھا، لیکن پھر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ شاید پیدائشی نشان ہے۔

"یار فاروق یہ نشان کس قدر عجیب ہے۔" محمود نے دبے دبے لہجے میں کہا تاکہ موٹا آدمی نہ سن لے۔

"اس حد تک بھی نہیں کہ ہم اپنی گفتگو کا موضوع بنا لیں۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"نہیں! یہ بات غلط ہے، نشان ضرور عجیب ہے۔ اگر یہ مثلث نما نہ ہوتا اور تل کی شکل کا ہوتا تو بھی اسے عجیب ہی کہا جاتا، کیونکہ سرخ رنگ کے تل کا نشان ہم نے شاید ہی کسی کے چہرے پر کبھی دیکھا ہو۔ عام طور پر تل سیاہ رنگ کے یا بھورے رنگ کے ہوتے ہیں، سرخ تل دیکھنے میں نہیں آتے، لیکن یہ تو تل بھی نہیں ہے، اس صورت میں کیا ہم اسے عجیب و غریب نہیں کہہ سکتے۔" محمود نے اچھی خاصی تقریر جھاڑ ڈالی۔

"صرف عجیب ہی کہہ لو، اب غریب کا لفظ تو ساتھ میں شامل نہ کرو، شکل صورت اور کپڑوں سے یہ مجھے کوئی بہت دولت مند لگتا ہے۔"

"مذاق نہ کرو بھائی... میں سنجیدہ ہوں۔"

"کمال ہے یار... ایک تکونے سے نشان نے تمہیں سنجیدہ کر دیا۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں! میں اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔"

"اللہ رحم کرے، کل کو کسی کے چہرے پر تمہیں شہد کی مکھی کا نشان نظر آ گیا تو تمہارا کیا حال ہو گا۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"تم غور سے دیکھو تو سہی۔"

"سنو بھائی! میں نے سکول میں تل کے نشانوں اور ان کی قسموں کے بارے میں کچھ نہیں پڑھا، نہ گھر میں اس سلسلے میں کچھ کتابوں کو کھنگالا ہے، لہٰذا مجھے تو معاف ہی رکھو۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"خیر... تم توجہ نہ دو... لیکن شاید کل تمہیں اس بات پر افسوس ہو کہ تم نے اس نشان پر توجہ کیوں نہیں دی تھی... میں تو خیر اس شخص کے بارے میں بہت کچھ سوچ چکا ہوں۔"

"ارے باپ رے۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔ "ذرا میں بھی تو سنوں تم کیا کچھ سوچ چکے ہو۔"

"یہ کہ جب یہ یہاں سے جائے گا تو میں اس کا تعاقب کروں گا اور اور معلوم کروں گا کہ یہ کون ہے، کیا کرتا ہے، کہاں رہتا ہے۔"

"حد ہو گئی... یعنی تم صرف اس سرخ تکونے نشان کے لیے اتنی باتیں معلوم کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرو گے۔"

"مجھے دوڑ لگانے کی ضرورت ہے نہ دھوپ کرنے کی... میں تو صرف تعاقب کروں گا۔"

"اچھا بھائی، کر لینا تعاقب! میرا کیا جاتا ہے۔ ہاں اتنا کہے دیتا ہوں کہ مجھے نہ تو اس نشان سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ نشان والے سے اور نہ میں تعاقب کے وقت تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"نہ دینا... مجھے ضرورت بھی نہیں ہے تمہارے ساتھ کی۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"تو پھر تلملا کیوں رہے ہو۔" فاروق مسکرایا۔

"تلملانا ہے میرا جوتا۔" محمود بولا۔

"تلملاتا ہو گا... مجھے کیا معلوم!" فاروق نے کندھے اچکاتے اور

ایک اچٹتی سی نظر موٹے آدمی پر ڈالی، ساتھ ہی وہ چونک اٹھا۔

موٹے آدمی نے بنچ پر اپنا پرس اور سنہری فریم والی عینک رکھ چھوڑی تھی۔ رومال اب تک اس کے ہاتھ میں تھا جس سے وہ بار بار اپنے چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔

"تکونا نشان عجیب ہو نہ ہو، ایک بات ضرور ہے۔" اچانک فاروق نے کہا۔

"وہ کیا!" محمود نے خوش ہو کر جلدی سے کہا۔

"یہ کہ یہ آدمی جتنا موٹا ہے، اس کی عقل اتنی ہی پتلی دبلی ہے۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟" محمود نے اسے گھورا۔

"اس طرح کہ اس نے اپنا پرس اور عینک بنچ پر رکھ دیے ہیں، شاید اسے نہیں معلوم... پارکوں میں جیب کترے عام پھرتے رہتے ہیں جو لوگوں کی جیبوں سے چیزیں لے اڑتے ہیں۔ بنچ پر سے کوئی چیز لے کر چمپت ہونا تو ان کے لیے کوئی بات ہی نہیں۔ عینک بھی کچھ کم قیمتی نظر نہیں آتی، یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے پرس میں کوئی بڑی رقم نہ ہو، لیکن پرس چونکہ پھولا ہوا ہے، اس لیے خالی نہیں ہو سکتا۔"

"ہوں! تمہاری بات خاصی وزنی ہے... لیکن ہو سکتا ہے یہ شخص بہت ہی زیادہ مال دار ہو۔"

"اس سے بھی میری ہی بات ثابت ہوتی ہے۔ کیا تم اتنے لاپروا آدمی کو عقل مند کہو گے؟"

"نہیں... خیر میں اسے عقل مندی تو نہیں کہہ سکتا۔" محمود بولا۔

"بس پھر... تم اس کے تعاقب کا خیال چھوڑ دو، ایک بے وقوف آدمی کا تعاقب کیا کرنا۔"

"اس کے باوجود یہ سرخ نشان مجھے مجبور کر رہا ہے۔" محمود نے کہا۔

"اچھا بھائی جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو سکول کا کام شروع کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر فاروق نے کتابوں کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک عجیب واقعہ ہوا۔

محمود اور فاروق بس اتنا دیکھ سکے کہ ایک نوجوان آدمی تیر کی طرح اس موٹے آدمی کی طرف آیا اور پھر کسی چھلاوے کی طرح پارک کے دروازے کی طرف دوڑتا نظر آیا، دوسرے ہی لمحے موٹا آدمی چلا اٹھا:

"وہ لے گیا... لے گیا... اسے پکڑو۔"

محمود اور فاروق نے فوری طور پر یہی خیال کیا کہ جیب کترا پرس لے اڑا ہے، لیکن جب ان کی نظر بنچ پر پڑی تو عینک اور پرس وہاں موجود تھے۔ ابھی وہ حیران ہی تھے کہ موٹا آدمی لڑھکنے کے انداز میں بنچ سے گھاس پر آ گرا اور ان سے بولا:

"خدا کے لیے اس کے پیچھے دوڑو... اسے پکڑ لو... میں تمہیں

انعام دوں گا۔"

"لیکن وہ لے کیا گیا ہے۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"وہ... وہ میرا رومال لے گیا ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"کیا!!" محمود اور فاروق پوری قوت سے چلائے اور آس پاس کے لوگ موٹے کی بجائے انہیں گھورنے لگے، اس سے پہلے وہ موٹے کو گھور رہے تھے، کیونکہ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ موٹا کسے پکڑنے کے لیے کہہ رہا ہے۔

اور پھر نہ جانے محمود کے کیا جی میں آئی، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ آندھی اور طوفان کی طرح پارک کے دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔ اچکا اس وقت دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ فاروق کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ دونوں لمبی لمبی چھلانگیں لگاتے دروازے تک پہنچے اور پھر دائیں بائیں دیکھا، لیکن وہ انہیں کہیں بھی دوڑتا نظر نہ آیا، البتہ انہوں نے ایک کار ضرور تیزی سے شمالی سڑک پر جاتے دیکھی۔ کار کا رنگ نیلا تھا، اس سے زیادہ وہ کچھ نہ دیکھ سکے۔

"وہ شاید کار میں بیٹھ کر فرار ہو گیا ہے۔" محمود نے کہا۔

"یہ بات میرے پلے نہیں پڑی۔ اول تو یہی کچھ کم عجیب بات نہیں کہ اچکا بٹوے اور عینک کی بجائے اس موٹے آدمی کا رومال لے اڑا ہے اور دوسرے یہ اور بھی عجیب بات ہے کہ وہ کسی کار میں فرار ہو جائے۔ یعنی ایک رومال چور..." فاروق کے لہجے میں

حیرت تھی۔

"تمہارے پلے کبھی کوئی بات پڑی ہو تو کوئی بات بھی ہے۔" محمود نے جل کر کہا۔

"اگر تم کچھ سمجھ گئے ہو تو مجھے بھی بتا دو۔" فاروق مسکرایا۔

"میں کوئی سمجھنے کی مشین نہیں ہوں۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"ہاں! وہ تو فرزانہ ہے۔ خیر... اب کیا پروگرام ہے، رومال اڑانے والا تو جا چکا ہے۔"

"ہم واپس چلیں گے، ظاہر ہے پارک میں اپنی کتابیں چھوڑ آئے ہیں۔" اس نے کہا۔

"اور موٹے کو کیا جواب دیں گے۔" فاروق مسکرایا۔

"ہم موٹے سے کوئی وعدہ تو کر کے آئے نہیں تھے، بس یوں ہی دوڑ پڑے تھے۔" محمود نے کہا اور اندر جانے کے لیے مڑ گیا۔ دونوں اندر پہنچے۔ موٹے آدمی کے گرد اب اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو چکی تھی اور وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ ان دونوں پر نظر پڑتے ہی اس نے کہا:

"کیا وہ بھاگ گیا؟"

"ہاں! ہمیں افسوس ہے، وہ بھاگ گیا ہے۔ ہم اسے پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔"

"اوہ!" اس کے منہ سے افسوس زدہ انداز میں نکلا۔

"کیا وہ رومال بہت قیمتی تھا؟" محمود سے رہا نہ گیا، پوچھ ہی بیٹھا
"نہیں... عام رومال تھا۔" اس نے جواب دیا۔
"پھر آپ اس رومال کے لیے اتنے پریشان کیوں ہیں؟"
"اسی لیے پریشان ہوں کہ وہ رومال کیوں لے اڑا... پرس کیوں لے کر نہیں بھاگا؟" موٹے نے کہا اور محمود اور فاروق نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کا مطلب تھا، موٹا آدمی عقل سے پیدل نہیں ہے۔
"کیا آپ سمجھتے ہیں، رومال لے جانے سے اس کا کوئی خاص مقصد ہے؟" فاروق نے سوال کیا۔
"اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟" اس نے کہا۔
"ہوں... پھر اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"
"مم... میں... میں رپورٹ درج کراؤں گا..." اس نے کہا۔
"ایک رومال کی چوری کی؟" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔
"ہاں!" اس نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا، پھر ان دونوں کی طرف مڑا:
"میرا خیال ہے، تھانے دار میری بات پر یقین نہیں کرے گا، اگر تم دونوں میرے ساتھ چلے چلو تو میں بہت شکر گزار ہوں گا۔" اس نے کہا۔
"کیوں نہیں۔ ضرور۔ چلیے۔" محمود نے کہا۔ شاید وہ خود ہی اس

کے ساتھ جانے کا خواہش مند تھا، کیونکہ تھوڑی پہلے تعاقب کا پروگرام بنا چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ رومال کے واقعے نے سرخ نشان کا خیال اس کے دل سے نکال دیا تھا۔ دونوں اس کے ساتھ پارک سے باہر نکلے اور پھر یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ موٹا آدمی ایک بہت لمبی سی شاندار کار کی طرف بڑھ رہا تھا، کار بالکل نئی تھی۔
"یہ کار آپ کی ہے؟" محمود کے منہ سے نکلا۔
"ہاں! میرا نام انور کریم ہے، اگر وہ شخص رومال کی بجائے پرس لے جاتا تو میں کبھی نہ چلاتا..."
"آپ نے پرس بنچ پر کیوں رکھ دیا تھا؟" فاروق نے سوال کیا۔
"اس کا بوجھ جیب میں محسوس ہو رہا تھا؟" اس نے کہا۔
"شاید اس میں کوئی بڑی رقم نہیں تھی؟" محمود نے کہا۔
"ہاں! اتنی بڑی نہیں تھی۔ آٹھ نو ہزار ہوں گے۔" اس نے لاپرواہی سے کہا اور وہ حیران رہ گئے، یعنی آٹھ نو ہزار روپے اس کے نزدیک معمولی رقم تھی۔
"آپ کے خیال میں وہ آپ کا رومال کیوں لے گیا ہے؟" فاروق نے پوچھا۔
"مجھے نہیں معلوم... یہی بات تو میرے لیے پریشانی کی وجہ ہے۔" انور کریم نے کہا۔ "آخر وہ میرا رومال کیوں لے گیا ہے؟"
"وہ رومال آپ نے کب خریدا تھا؟" محمود نے سوال کیا۔

"پتا نہیں، ایسی چھوٹی موٹی چیزیں میں اپنے ملازم کے ذریعے بازار سے منگوا لیا کرتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"کہیں اس رومال پر کسی خزانے کا نقشہ تو نہیں بنا ہوا تھا۔" فاروق نے پوچھا۔

"کیا بات کرتے ہو، پانچ چھ روپے والے رومال پر خزانے کا نقشہ کہاں سے آ سکتا ہے۔" انور کریم بولا۔

"تو کیا سو دو سو روپے کے رومال پر خزانے کا نقشہ ہوتا ہے۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"مجھے نہیں معلوم....." اس نے جھلا کر کہا۔

"تو آپ ہم پر کیوں گرمی جھاڑ رہے ہیں، کیا آپ کا رومال ہم نے چرایا ہے۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"اوہ مجھے افسوس ہے، تم دونوں نے تو میری مدد کی ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ آپ کاروبار کیا کرتے ہیں۔" محمود نے پوچھا۔

"میں... سرکاری ملازم ہوں۔ کیوں تم نے یہ کیوں پوچھا۔"

"بس یونہی... آپ کی کار دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔"

"یہ کار تو میری بیوی جہیز میں لائی تھی، وہ بہت دولت مند باپ کی بیٹی ہے۔"

"اور آپ کی بیوی کے والد کیا کام کرتے ہیں۔" محمود نے پوچھا۔

"تم تو جاسوسوں کی طرح سوالات کر رہے ہو۔" اس نے دونوں کی طرف گھور کر دیکھا، ساتھ میں وہ کار بھی چلا رہا تھا۔

"لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ جاسوس اس طرح سوالات کرتے ہیں۔" محمود نے اُلٹا اس سے پوچھا... اور انور کریم کی حیرت بڑھ گئی۔ اس نے کار فٹ پاتھ کے ساتھ روک لی اور چند لمحے تک دونوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہنے کے بعد بولا:

"رومال کے بارے میں تو میں سوچوں گا اور رپورٹ درج کراؤں گا، پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو، میں نے آج تک تمہاری عمر کے لڑکوں کو اس طرح باتیں کرتے اور سوالات کرتے نہیں سنا۔"

"ہم لڑکے ہیں جناب اور اس سے زیادہ اپنے بارے میں کیا کہیں۔" فاروق نے کہا۔

"یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ تم لڑکے ہو... لیکن ہو تم عجیب لڑکے۔"

"عجیب لڑکے ہونا کوئی جرم تو نہیں ہے جناب۔" فاروق نے کہا، ساتھ ہی محمود بولا:

"جلدی چلیے، ہمیں ابھی اپنے گھر بھی پہنچنا ہے، ہم تو آپ کے ساتھ چشم دید گواہ کے طور پر آئے ہیں، اگر آپ کو ہمارا ساتھ چلنا منظور نہیں تو ہمیں اُتار دیں۔"

"اوہ! ہاں واقعی... تم ٹھیک کہتے ہو۔" یہ کہہ اس نے پھر کار چلا

دی... اس کے بعد کار میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ نیشنل پارک کے تھانے کے سامنے پہنچ گئے۔ کار سے اُتر کر وہ اندر پہنچے۔ تھانیدار ایک طرف تو انور کریم کو دیکھ کر حیران ہوا، دوسری طرف محمود اور فاروق کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، وہ شاید انہیں پہچانتا تھا:

"آپ!" اس کے منہ سے نکلا۔

"میں ایک رپورٹ درج کرانے آیا ہوں شیخ صاحب... اور یہ دونوں لڑکے گواہی دیں گے۔" انور کریم نے کہا۔

"لڑکے!" تھانے دار کے منہ سے نکلا۔

"ہاں لڑکے... کیا یہ آپ کو لڑکے نظر نہیں آتے؟" انور کریم نے حیران ہو کر کہا۔

"شاید آپ کو معلوم نہیں، یہ محمود اور فاروق ہیں۔"

"محمود اور فاروق ہیں۔ کیا مطلب؟" اس کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"مطلب یہ کہ یہ انسپکٹر جمشید کے بیٹے ہیں؟" تھانے دار بولا۔

"کیا!!!" انور کریم کے منہ سے نکلا۔

اس کی آنکھیں مارے حیرت کے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

کان غائب

نیلے رنگ کی کار ایک کوٹھی کے سامنے رُکی۔ اس میں سے ایک سرمئی رنگ کے سوٹ والا آدمی نکلا اور کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ کوٹھی کے اندرونی کمرے میں ایک اور آدمی بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں، آنکھیں بڑی بڑی اور گہرے سیاہ رنگ کی تھیں جو کسی قدر خوفناک دکھائی دیتی تھیں۔ جونہی کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی، وہ چونک اُٹھا۔ اُس نے دروازہ کھول دیا۔ سرمئی سوٹ والا اندر داخل ہوا تو اُس نے فوراً پوچھا۔

"کہو کیسا رہا... ناکامی؟"

"رومال لے آیا ہوں باس!"

"بہت خوب! یہ کام کیا ہے تم نے... ہاتھ کہاں مارا؟"

"دو گھنٹے سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا، آخر نیشنل پارک میں موقع ہاتھ آگیا۔ وہ کار سے اُتر کر پارک میں چلا گیا اور پھر ایک پتھر کے بنچ پر بیٹھ گیا۔ رومال اُس نے نکال کر ہاتھ میں لے لیا،

تاکہ پسینہ خشک کر سکے۔ بس میں نے رومال جھپٹ لیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔"

"بہت خوب! کسی نے تمہارا تعاقب تو نہیں کیا؟" باس نے پوچھا۔

"دو لڑکے بھاگے تو تھے۔ مگر اتنی دیر میں میں کار میں بیٹھ چکا تھا۔" اُس نے کہا۔

"یوں بھی ایک رومال کے لیے کوئی کیوں کوشش کرنے لگا، لیکن یہ تو میں جانتا ہوں کہ اس رومال کی کیا قیمت ہے۔"

"کیا قیمت ہے باس... کیا آپ مجھے نہیں بتائیں گے؟"

"کیوں نہیں تابانی... تم تو میرے خاص آدمی ہو... تمہیں نہیں بتاؤں گا تو کسے بتاؤں گا۔ اس رومال کی قیمت ہے پچاس ہزار روپے۔" باس نے مسکرا کر کہا۔

"جی!!؟" تابانی کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

"ہاں تابانی... دس ہزار کے تم بھی حق دار ہو گئے، کیونکہ تم نے بھی بہت کام کیا ہے۔" باس نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ باس!" تابانی خوش ہو کر بولا۔

"یہ دس ہزار تمہیں کل اس وقت مل جائیں گے، کیونکہ اس وقت تک رومال سے کام لیا جا چکا ہو گا، لیکن اس کے ساتھ ہی تم یہ بات بالکل بھول جاؤ گے کہ کبھی تم نے انور کریم کا رومال اڑایا تھا۔"

"یہ بات تو مجھے اب بھی یاد نہیں ہے باس، بلکہ میں تو انور کریم

نام کے کسی آدمی کو جانتا تک نہیں۔" تابانی نے کہا۔

"شاباش! مجھے ایسے ہی ہوشیار آدمی کی ضرورت ہے۔ اب تم جا سکتے ہو، کل تک آرام کرو، کل شام پھر تمہیں ایک کام سونپا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے باس! میں حاضر ہو جاؤں گا۔" اس نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔

اس کے نکلتے ہی مونچھوں والا آدمی فون پر جھک گیا اور کسی کے نمبر ڈائل کرنے کے بعد بولا:

"ہیلو... جانی... آج رات کام ہو جائے گا، ہر طرح تیاری مکمل ہو چکی ہے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ آج کام ضرور ہو جائے گا؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"میں کچے کام کبھی نہیں کرتا۔ اس کا اندازہ تمہیں کل ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، ہم کل ہی ملیں گے۔"

"ضرور! ملاقات ہونے پر ہی ہم آئندہ پروگرام ترتیب دے سکیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کمرے کی ایک الماری کھول کر اس میں سے ایک بوتل نکالی، بوتل میں کوئی سیاہ رنگ کا سیال تھا۔ بوتل لے کر وہ کوٹھی کے اندرونی

دروازے سے باہر نکلا اور دیوار کے ساتھ چلتا ہوا کوٹھی کے پچھلے حصے میں آیا۔ یہاں تاروں سے بنا ہوا ایک بہت لمبا چوڑا کمرہ تھا۔ کمرے کے دروازے پر ایک موٹا سا تالا لگا ہوا تھا، وہ تالے پر جھکا اور اسے کھولنے لگا، پھر جونہی تالا کھلا، اور اس نے دروازے کے پٹ کھولے ایک خوفناک غراہٹ سنائی دی۔ اندر داخل ہوا تو سیاہ رنگ کا ایک بہت بڑا کتا اس کے پیروں میں لوٹنے لگا۔ چند منٹ تک وہ اسی طرح کھڑا کتے کو لوٹتے دیکھتا رہا... پھر اس نے بوتل کے منہ پر سے کارک اتارا اور جھک کر بوتل کتے کے منہ سے لگا دی۔ سیال کتے کے حلق میں اترنے لگا۔ وہ اسے مزے لے کر پی رہا تھا۔ پوری بوتل خالی ہونے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کتے کے منہ سے نکلنے والی غراہٹیں اب ہلکی ہو چلی تھیں، پھر وہ زمین پر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ اب وہ گہری نیند سو گیا تھا۔

○

انسپکٹر جمشید ابھی تک اپنے دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے جب کہ باقی سب لوگ جا چکے تھے، بس دفتر کا چوکیدار بیرونی دروازے پر موجود تھا۔ وہ تو دن رات یہیں رہتا تھا۔ اس لیے دروازے پر موجود تھا۔ ورنہ انسپکٹر جمشید کسی کو اپنے ساتھ روکنا پسند نہیں

کرتے تھے۔ اکرام اور ان کے چپراسی نے کئی مرتبہ ان سے کہا بھی کہ وہ بھی ان کے ساتھ ہی چھٹی کر لیا کریں گے مگر انہوں نے یہ منظور نہ کیا، وہ ہمیشہ دوسروں سے ایک گھنٹے بعد چھٹی کرتے تھے اور ابھی چھٹی کرنے میں آدھ گھنٹہ باقی تھا کہ چوکیدار ان کے کمرے میں داخل ہوا۔

"ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں جناب! میں نے اُن سے کہا بھی تھا کہ دفتر کا وقت ختم ہو گیا ہے، مگر انہوں نے کہا کہ وہ جانتے ہیں، آپ ابھی موجود ہوں گے۔"

"انہوں نے اپنا کیا نام بتایا؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"امجد رؤف۔" اس نے کہا۔

"اوہ!" انسپکٹر جمشید چونکے۔ امجد رؤف محکمہ داخلہ کے ڈپٹی سیکرٹری تھے۔

"انہیں اندر لے آؤ۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

چوکیدار باہر چلا گیا... جلد ہی امجد رؤف اندر داخل ہوئے۔ انسپکٹر جمشید نے اُٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا اور مسکرا کر بولے:

"آپ نے کیوں زحمت کی، فون کر دیا ہوتا۔ میں خود حاضر ہو جاتا۔"

"ہمیشہ پیاسا کنوئیں کے پاس چل کر آتا ہے، نہ کہ کنواں پیاسے کے پاس۔" امجد رؤف نے نرم گرم لہجے میں کہا۔

"فرمایئے! میں آپ کے کیا کام آ سکتا ہوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ دوسروں سے ایک گھنٹہ بعد چھٹی کرتے ہیں، اسی لیے اس وقت آیا ہوں تاکہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ میں آپ سے ملنے آیا ہوں، آپ بھی اس راز کو اپنے تک ہی رکھیے گا، کسی سے یہ نہ کہیے گا کہ امجد رؤف آپ سے ملنے آیا تھا۔" انہوں نے کہا۔

"اچھی بات ہے، میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔" انہوں نے کہا۔

"تو سنیے! میں چند دنوں سے زبردست خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔" امجد رؤف نے کہا۔

"خطرہ ــــ کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"میری زندگی کو خطرہ ہے، کوئی میری جان لینا چاہتا ہے۔" امجد رؤف نے کہا۔

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"تین چار روز سے رات کے وقت کوئی میری کوٹھی کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے، لیکن چونکہ چار دیواری بہت اونچی ہے اور اس کے اوپر خار دار تار بھی لگے ہیں، دروازہ بھی بہت مضبوط ہے، اس لیے وہ جو کوئی بھی ہے، اندر داخل ہونے میں کامیاب نہیں ہوتا..." انہوں نے بتایا۔

"آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ کوئی اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے۔"

"رات کے وقت دروازے پر کوئی زور آزمائی کرتا ہے، زور آزمائی کرنے کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔"

"اوہ! کیا آپ نے کوئی چوکیدار نہیں رکھا ہوا؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"نہیں! میں نے کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی... میں نے بتایا نا چار دیواری بہت اونچی ہے اور اس پر خار دار تاروں کی باڑ بھی لگی ہے۔ دروازہ حد درجے مضبوط ہے۔"

"ہوں! میں سمجھ گیا، اگر یہ بات ہے تو آپ نے پولیس کی مدد کیوں حاصل نہیں کی؟"

"میں ان کی کارگزاری سے مطمئن نہیں، اس لیے سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔"

"خیر! اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں، آپ کسی طرح یہ معلوم کریں کہ وہ کون ہے؟"

"خیر! یہ تو میں معلوم کر لوں گا، لیکن سوال تو یہ ہے کہ جو آدمی رات کو وار کرنے میں ناکام رہا ہے، کیا وہ دن کے وقت حملہ نہیں کرے گا، اس کے لیے آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"میں نے اس کا بھی بندوبست کر لیا ہے، میری کار پہلے ہی بلٹ پروف ہے، گولی اس سے نہیں گزر سکتی... دوسرے یہ کہ میرے پاس ہر وقت بھرا ہوا پستول رہتا ہے اور میرا نشانہ بھی بہت

اچھا ہے۔" امجد رؤف نے کہا۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ میں آج رات آپ کے ہاں آؤں گا اور دیکھوں گا کہ کیا معاملہ ہے۔"

"بس! میں یہی چاہتا تھا، میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"اس میں احسان کی کیا بات ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

امجد رؤف اُٹھ کھڑے ہوئے، انہوں نے انسپکٹر جمشید سے ہاتھ ملایا اور ان کے کمرے سے نکل آئے۔ ابھی انہیں کمرے سے گئے ایک منٹ بھی نہیں ہوا تھا کہ گولی چلنے کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ وہ اچھل کر کمرے سے نکلے اور دروازے کی طرف دوڑے، انہوں نے دیکھا، امجد رؤف محکمہ سراغرسانی کی عمارت کے مین گیٹ پر گرے پڑے تھے اور چوکیدار ان پر جھکا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔

"خیر تو ہے۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"ان پر فائر کیا گیا ہے جناب؟" چوکیدار نے بتایا۔

"تو کیا..." انسپکٹر جمشید نے بوکھلا کر کہا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ گولی ان کے سر پر سے گزر گئی ہے۔" یہ کہتے ہوئے چوکیدار نے امجد رؤف کو سیدھا کر دیا۔ ان کا رنگ خوف سے پیلا پڑ چکا تھا اور سانس زور زور سے چل رہا تھا۔

"اُف خدا... اگر گولی ذرا نیچے ہوتی تو اس وقت میں اس دنیا میں نہ ہوتا۔" اُن کے منہ سے نکلا۔

"کوئی آدمی اس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک اس کی موت کا وقت نہ آ جائے، بال بال بچنے پر میری طرف سے مبارک باد قبول فرمایئے... کیا آپ نے حملہ آور کو دیکھا تھا؟"

"نہیں... میں نے تو بس فائر کی آواز سنی تھی اور میں خوف کی وجہ سے گر پڑا تھا۔" انہوں نے کہا۔

"شیر خان! تم نے تو حملہ آور کی جھلک نہیں دیکھی؟"

"جی ہاں! دیکھی تھی... بلکہ میں نے اسے بالکل صاف دیکھا تھا۔ اس کا رنگ بالکل کالا تھا اور دایاں کان نہیں تھا۔"

"کیا کہا! کان نہیں تھا۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

"جی ہاں! میں نے یہ چیز بالکل صاف دیکھی تھی۔"

"اوہ!" انہوں نے کہا اور پھر جلدی سے بولے: "امجد صاحب! آپ کار میں بیٹھ کر گھر چلیں، میں حملہ آور کے پیچھے جاتا ہوں، آپ گھر سے باہر نہیں نکلیں گے جب تک میں نہ آ جاؤں۔"

یہ کہتے ہی وہ موٹر سائیکل کی طرف دوڑے۔

فرزانہ کی چیخ

محمود اور فاروق نے گھر کے دروازے پر پہنچ کر گھنٹی بجائی۔ ان کا گھنٹی بجانے کا انداز مخصوص تھا۔ دروازہ فرزانہ نے کھولا اور پھر چونک اٹھی:

"کیا بات ہے، تم تھانے میں کیا کرنے گئے تھے؟"

"کیا مطلب؟" دونوں نے ایک ساتھ بوکھلا کر کہا۔

"میں نے فارسی میں بات نہیں کی، میں جانتی ہوں، تمہیں فارسی نہیں آتی، سنسکرت میں بات اس لیے نہیں کی کہ خود مجھے نہیں آتی... انگریزی میں اس لیے نہیں بولی کہ تمہاری انگریزی اتنی اچھی نہیں۔"

"کیا کہا... ہماری انگریزی اچھی نہیں... چلو پھر آج ہو جائے انگریزی کا مقابلہ۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"مجھے منظور ہے۔ یہ مقابلہ ضرور ہوگا۔" فاروق نے مکا ہوا میں لہرایا۔

"لیکن اس سے پہلے تمہیں یہ ضرور بتانا ہوگا کہ تم تھانے میں

کیا کرنے گئے تھے۔" فرزانہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ محمود اور فاروق کا مارے حیرت کے برا حال تھا۔

"آخر تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ ہم تھانے گئے تھے۔" محمود نے کہا۔

"تو کیا تم نہیں گئے تھے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"گئے تھے بابا گئے تھے۔ چلو اب بتاؤ... تمہیں کیسے معلوم ہوا۔"

"اپنے جوتوں کو غور سے دیکھو۔"

دونوں نے بوکھلا کر جوتوں کی طرف دیکھا... جوتوں کی نوکوں پر سرخ بجری کا نشان لگا تھا۔ وہ فوراً سمجھ گئے۔ بجری تھانے کی روش پر پھیلی ہوئی تھی اور اس پر چلتے وقت جوتوں کی نوکوں پر بجری لگ گئی تھی۔

"دھت تیرے کی، اتنی ذرا سی بات پر ہم یونہی حیران ہو رہے تھے۔" محمود نے ران پر ہاتھ مارا۔

"عقل استعمال کیا کرو۔" فرزانہ بولی۔

"وہ تو اب ہم انگریزی کے مقابلے میں کریں گے۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"تم نے بتایا نہیں، تھانے کیوں گئے تھے۔"

"شامت نے آواز دی تھی۔" فاروق بولا۔

"اچھا! پھر ملاقات ہوگئی شامت سے۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں! ہوئی تھی ملاقات... تمہیں بہت یاد کر رہی تھی۔" محمود

نے کہا۔

"اچھا... تو تم نہیں بتاؤ گے؟" فرزانہ نے آنکھیں نکالیں۔

"نہیں بتاتے، جاؤ۔" محمود نے جھگڑالو عورتوں کے سے انداز میں کہا۔

"بہت اچھا! نہ بتاؤ، لیکن کہے دیتی ہوں، پچھتاؤ گے۔" فرزانہ نے دھمکی دی۔

"اچھا پچھتا لیں گے۔" فاروق نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

"کیا کرو گی تم؟" محمود نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

"میں ابّا جان کو صرف یہ بتاؤں گی کہ تم دونوں آج تھانے گئے تھے، بس وہ خود ہی معلوم کر لیں گے کہ تم تھانے کیا کرنے گئے تھے۔" فرزانہ نے کہا۔

دونوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آخر محمود نے کہا:

"یار اس شیطان کی خالہ سے اللہ بچائے، بتا دو اسے ہم تھانے کیا کرنے گئے تھے۔"

"اچھی بات ہے۔" فاروق نے کہا اور سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ فرزانہ یہ سن کر دھک سے رہ گئی۔ تینوں اب اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ آخر فرزانہ نے کہا:

"سوال تو یہ ہے، وہ اُس رومال کا کیا کرے گا؟"

"اس کا جواب تو وہی دے سکے گا۔"

"کیوں... کیا ہمیں اللہ تعالیٰ نے عقل سے نہیں نوازا؟"

"ہاں! عقل تو اس نے ہمیں خوب عطا کی ہے۔"

"تو بس پھر... اس سے کام لے کر ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ رومال کا کیا کرے گا۔" فرزانہ نے کہا۔

"اس پائے کی عقل ہمارے پاس نہیں ہے، ذرا تم ہی اپنی عقل سے کام لے کر دکھاؤ۔" محمود نے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ یہ کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ دیکھو نا... فرض کیا کوئی شخص رومال والے کو ختم کرنا چاہتا ہے اور قاتل کی حیثیت سے خود سامنے آنا نہیں چاہتا، لہٰذا وہ یہی کرے گا کہ اس کا رومال یا کوئی اور کپڑا اُڑا لے گا۔" فرزانہ نے کہا۔

"واہ! کتنی زبردست بات سمجھائی ہے تم نے، یعنی تمہارا مطلب ہے، وہ رومال کے صدمے سے مر جائے گا، لیکن تمہاری اطلاع کے لیے اتنا عرض کر دوں کہ وہ ہمارے ساتھ تھانے تک گیا تھا، اس نے وہاں رپورٹ لکھوائی تھی اور بطور گواہ ہم دونوں نے دستخط کیے تھے، اس کے بعد وہ اپنی کار میں بیٹھ کر اپنے گھر چلا گیا تھا، اگرچہ اس نے ہمیں گھر تک چھوڑ جانے کی پیش کش کی تھی، لیکن ہم نے منظور نہ کیا، کیونکہ ہم چہل قدمی کرتے ہوئے گھر آنا چاہتے تھے۔"

"بہت خوب! وہ زندہ ہے، تم یہی کہنا چاہتے ہو، لیکن کل کا

اخبار میرے بیان کی تصدیق کر دے گا۔" فرزانہ نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے، وہ رومال والا مر چکا ہو گا۔" فاروق کے لہجے میں تعجب تھا۔

"ہاں! میرا تو خیال یہی ہے، یا کم از کم شدید زخمی ضرور ہو جائے گا۔"

"آخر کیسے؟" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"پہلے اس آدمی کا نام بتاؤ تاکہ کل صبح یا شام کے اخبارات میں میں اپنے اندازے کی تصدیق کر سکوں۔"

"اس کا نام انور کریم ہے۔ کسی محکمے میں سرکاری ملازم ہے۔"

"کیا!!!" فرزانہ اس قدر زور سے چلائی کہ دونوں بوکھلا اُٹھے۔

○

انسپکٹر جمشید نے موٹر سائیکل ایک بہت پرانے اور بوسیدہ سے مکان کے سامنے روک لی۔ پھر نیچے اُتر کر دروازے کی گھنٹی بجائی مگر کسی نے آکر دروازہ نہ کھولا جس کا مطلب یہ تھا کہ اندر کوئی نہیں، انہوں نے ایک دو لمحے کے لیے سوچا اور پھر موٹر سائیکل کچھ فاصلے پر لے جا کر کھڑی کر دی اور دوبارہ اس مکان کے دروازے پر پہنچے انہوں نے دروازے کو ایک زور دار دھکا دیا تو اس کے پٹ کھل گئے۔ وہ اندر داخل ہو گئے اور دروازہ دوبارہ بند کر دیا، لیکن اندر سے چٹخنی نہ لگائی۔ صحن سے آگے ایک کمرے کا دروازہ تھا، اندر

بے سر و سامانی کا عالم تھا، کوئی فرنیچر تھا نہ برتن وغیرہ۔۔ کمرے میں ایک چارپائی، ایک میز اور دو کرسیوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

انسپکٹر جمشید ان میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ٹانگیں پھیلا کر دوسری کرسی پر رکھ لیں اور سر کرسی کی پشت پر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ تقریباً آدھ گھنٹہ گزرنے کے بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور کمرے کے دروازے کی طرف جما دیں۔ قدموں کی آواز آئی اور پھر ایک شخص سامنے آ گیا۔ اس کا دایاں کان غائب تھا۔ آنے والے کی نظر جونہی انسپکٹر جمشید پر پڑی، اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ آنکھوں میں خوف، حیرت اور نفرت کی لہریں نمودار ہو گئیں۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ جیب میں گیا اور جب باہر نکلا تو اس میں پستول تھا انسپکٹر جمشید پُرسکون انداز میں یہ سب کچھ دیکھتے رہے تھے، ابھی تک انہوں نے اپنے جسم کے کسی حصّے کو ذرا بھی حرکت نہیں دی تھی۔ آنے والے نے جب پستول کا رُخ ان کی طرف کر دیا تو وہ بھرپور انداز میں مسکرائے اور بولے:

"بہت خوب چنگیزی۔۔۔ مجھے تم سے یہی اُمید تھی، چلو اب یہ بتاؤ کہ تم نے امجد رؤف پر گولی کس کے کہنے پر چلائی ہے؟"

"اپنی مرضی سے چلائی تھی اور اب تم پر بھی چلاؤں گا۔" چنگیزی نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"پہلے اپنی آواز پر قابو پالو اور پھر اپنے ہاتھ کی طرف دیکھو کس طرح لرز رہا ہے، کیا اس حالت میں تم فائر کر سکو گے، تمہارے فائر سے تو امجد رؤف کا کچھ نہیں بگڑ سکا، گولی اس کے سر پر سے گزر گئی، میرا تم کیا بگاڑ لو گے، ہاں اگر تم صرف اتنا بتا دو کہ تم نے یہ کس کے کہنے پر کیا ہے، تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری مرمت نہیں کروں گا، تھانے والے بھی تمہیں کچھ نہیں کہیں گے، لیکن قاتلانہ حملہ کرنے پر مقدمہ تو ضرور چلے گا۔"

"میں اپنی مرضی کا خود مالک ہوں۔" چنگیزی نے غرا کر کہا، لیکن اس کی غراہٹ بھی بھیک مانگتی نظر آ رہی تھی۔

"اس کے باوجود دوسروں کے لیے کام کرتے رہتے ہو۔ بتاؤ کس کے لیے کام کر رہے ہو ان دنوں۔"

"امجد رؤف کے لیے!" چنگیزی مسکرایا۔

"بکو مت!" انسپکٹر جمشید کو غصہ آ گیا، وہ بجلی کی طرح کرسی سے اُٹھے اور چنگیزی کی پیشانی پر ایک مکا دے مارا۔ چنگیزی پستول چلانے کی حسرت ہی لیے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

"اب پولیس خود ہی تم سے معلوم کر لے گی۔"

یہ کہہ کر وہ گھر سے نکل آئے اور ایک پبلک فون بوتھ سے پولیس کو فون کر کے واپس لوٹے، لیکن جوں ہی چنگیزی کے گھر میں داخل ہوئے، اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گئے۔ خون

کمرے کے فرش پر پھیلتا ہوا دروازے تک آ گیا تھا۔ جب کہ ان کے مکے سے چنگیزی صرف بے ہوش ہوا تھا۔ لیکن اب اب اس کی کمر میں ایک خنجر دستے تک پیوست تھا۔

وہ شخص اپنا کام کر گیا تھا جو چنگیزی سے کام لے رہا تھا۔

حملہ ہوتا ہے

فرزانہ کی چیخ پورے گھر میں گونج کر رہ گئی تھی۔ بیگم جمشید دوڑی آئیں۔ انہوں نے گھبرا کر پوچھا:

"کیا ہوا میری بچی؟!"

"کچھ نہیں امی جان! اسے حیرت کا دورہ پڑا ہے۔" فرزانہ کی بجائے فاروق نے کہا۔

"کیا مطلب... حیرت کا دورہ؟" بیگم جمشید کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

"آپ نے شاید اس دورے کا نام آج ہی سنا ہے، لیکن یہ ہم تینوں پر عام طور پر پڑتا ہی رہتا ہے۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"تمہاری تم ہی جانو!" بیگم جمشید نے منہ بنا کر کہا اور بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

"مہربانی فرما کر اب حیرت کی وادی سے واپس آجاؤ اور یہ بتاؤ کہ انور کریم کا نام سن کر تم اتنے زور سے کیوں چلائی تھیں۔ انور کریم کسی جن بھوت کا نام تو ہے نہیں، ایک موٹے تازے انسان کا نام ضرور

ہے، جو سرکاری افسر ہے اور کافی مال دار آدمی بھی ہے۔"

"ہاں! اور اس کی ایک بیٹی ہے جس کا نام عارفہ ہے، عارفہ میری کلاس فیلو ہے اور میں دو ایک مرتبہ اس کے ساتھ ان کے گھر جا چکی ہوں، انکل انور کریم سے بھی مل چکی ہوں۔" فرزانہ جیسے خواب میں بولتی چلی گئی۔

"اوہ... تم تو ان کے ساتھ رشتہ نکال بیٹھیں۔ خیر تم فکر نہ کرو، انہوں نے تھانے میں اپنی زندگی کو خطرے میں بتایا تھا، اس لیے تھانے دار نے رات بھر کے لیے ان کی کوٹھی کے گرد پہرہ لگا دیا ہے۔"

"اوہ... تب تو ٹھیک ہے، لیکن ہمیں بھی تو کچھ کرنا چاہیے۔"

"جو تم کہو، کیے لیتے ہیں۔"

"ہمیں ان کے متعلق ابا جان سے مشورہ کرنا پڑے گا، پھر جو وہ کہیں گے، کر لیں گے۔" فرزانہ نے کہا۔

"سوال تو یہ ہے کہ تم یہ کس طرح کہہ سکتی ہو، وہ خطرے میں ہیں۔"

"رومال اڑا کر لے جانا خطرے کی علامت ہے۔" فرزانہ بولی۔

"کیا تم صاف صاف نہیں بتا سکتیں؟" محمود نے کہا۔

"نہیں، کیونکہ ہو سکتا ہے، میرا اندازہ غلط ثابت ہو اور پھر تم میرا مذاق اڑاؤ۔"

"ہم وعدہ کرتے ہیں، مذاق نہیں اڑائیں گے، کوئی اور چیز اڑا لیں گے۔" فاروق نے کہا۔

"اور کیا چیز اڑاؤ گے، یہ بھی ابھی بتا دو۔" محمود نے جلدی سے کہا۔
"نہیں بتاؤں گی، تم تو ابھی مذاق اڑانے پر تلے ہو۔" فرزانہ نے تلملا کر کہا۔
"ارے! نہیں تو، ہم نے کب اڑایا ہے مذاق... تلنا تو رہا درکنار، کیوں محمود!" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔
"بالکل! ہم اور فرزانہ کا مذاق اڑا سکیں... یہ بھلا ہو سکتا ہے۔" محمود نے کہا۔
"آج ابھی تک ابا جان کیوں نہیں آئے... وقت تو ہو گیا ہے۔"
"ہو سکتا ہے، آج انہیں ہر چوراہے پر ٹریفک کے سگنل بند مل رہے ہوں... آ ہی رہے ہوں گے۔" محمود نے کہا۔
"بس ـــــ ان کے آنے پر بتاؤں گی، اس سے پہلے ہرگز نہیں۔" فرزانہ نے اٹل فیصلہ سنایا۔
"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" فاروق نے شریر لہجے میں پوچھا
"آخری سمجھ لو یا آخری سے پہلا۔" فرزانہ نے بھی مسکرا کر کہا۔
"شکر ہے، تم مسکرائیں تو... اس کا مطلب ہے... اب بتا دو گی۔"
"منہ دھو رکھو۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔
"ہر روز نہا دھو لیتے ہیں، پھر منہ دھو کر رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔" محمود نے کہا۔
"کان نہ کھاؤ۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

"اور کیا کھائیں... امی جان نے ابھی تک شام کا ناشتا تیار نہیں کیا اور اگر کر بھی لیا ہو تو ابھی ابا جان نہیں آئے۔ لہذا تمہارے کانوں پر ہی گزارا کرنا ہو گا۔" فاروق بولا۔
"میرے کان اتنے فالتو نہیں ہیں... اور پھر مجھے بغیر کانوں والا چہرہ ایک آنکھ نہیں بھائے گا۔"
"حیرت ہے... اب تک ابا جان نہیں آئے۔" محمود نے کہا، اسی وقت بیگم جمشید دوبارہ وہاں آئیں:
"بچو! ابھی تک تمہارے ابا جان نہیں آئے، شاید انہیں کوئی کام پڑ گیا ہے، چاہو تو تم شام کا ناشتا کر سکتے ہو۔" انہوں نے کہا۔
"نہیں امی جان! جب تک ابا جان نہیں آ جاتے، ہم ناشتا نہیں کریں گے۔" محمود نے کہا۔
"بالکل ٹھیک!"
"کیوں نہ ہم دفتر فون کر کے معلوم کریں۔" فرزانہ بولی۔
"ٹھیک ہے آؤ چلیں۔"
تینوں بیگم شیرازی کے ہاں پہنچے، انہیں سلام کیا اور فون کرنے کی اجازت لے کر ڈرائنگ روم میں آئے۔ یہاں فون ایک تپائی پر رکھا تھا۔ محمود نے محکمہ سراغرسانی کے نمبر ڈائل کیے۔ تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے چوکیدار کی آواز آئی:
"خان بابا... ابا جان یہاں سے جا چکے ہیں۔"

"جا تو چکے ہیں، لیکن وہ گھر کے لیے روانہ نہیں ہوئے تھے، ایک حملہ آور کے پیچھے گئے تھے۔"

"حملہ آور کے پیچھے — کیا کسی نے ابا جان پر حملہ کیا تھا؟" محمود نے گھبرا کر کہا۔

"ان پر نہیں، ان سے ملاقات کے لیے آنے والے ایک صاحب پر حملہ ہوا ہے۔" چوکیدار نے بتایا۔

"اوہ!" محمود کے منہ سے نکلا۔ "ملاقاتی کا نام کیا ہے؟ کیا وہ بچ گیا ہے؟"

"ہاں! بالکل بچ گیا ہے، اس کا نام امجد رؤف ہے۔ وہ کار میں بیٹھ کر اپنے گھر جا چکا ہے۔"

"اچھا... بہت بہت شکریہ!" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور انہیں ساری بات بتائی:

"اسی لیے وہ اب تک نہیں آئے۔"

"اور ہمیں انور کریم صاحب کے بارے میں ان سے مشورہ لینا ہے۔" فرزانہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"آؤ گھر چل کر مشورہ کرتے ہیں۔" محمود نے کہا۔

وہ پھر اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔

"ایک ترکیب تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہم میں سے دو انور کریم کے ہاں چلے جائیں اور ایک یہیں رہ کر ابا جان کا انتظار کرے، جب وہ آئیں تو انہیں ساری بات بتا دے۔" فرزانہ نے تجویز پیش کی۔

"اور دوسری ترکیب کیا ہو سکتی ہے؟"

"دوسری ترکیب یہ ہو سکتی ہے کہ ہم انور کریم صاحب کو فون کر دیں اور انہیں خطرے سے خبردار کر دیں یا پھر انہیں یہاں بلا لیتے ہیں۔"

"کیا یہاں آنے میں انہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ گھر سے نکلنا تو ان کے لیے اور بھی خطرناک ہوگا۔" محمود نے اعتراض کیا۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔" فاروق بولا۔

"تو کیا ہم صرف فون کریں؟" فرزانہ نے کہا۔

"میں تو کہتا ہوں، اس کی بھی ضرورت نہیں... ظاہر ہے کہ انہیں پہلے ہی خطرے کا احساس ہو چکا ہے۔" محمود نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں۔"

"تو پھر یہی مناسب رہے گا کہ ہم میں سے دو وہاں پہنچ جائیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کون کون جائے۔" فرزانہ نے کہا۔

"تمہارا جانا تو بہت ضروری ہے، کیونکہ تم ان کی بیٹی کی سہیلی ہو اور وہاں کئی مرتبہ جا بھی چکی ہے، ہم میں سے کسی کو بھی ساتھ لے لو۔" محمود نے کہا۔

"فاروق تو دماغ چاٹ جائے گا، اس لیے تم ہی میرے ساتھ چلے چلو۔"

"خدا کا شکر ہے۔ میں تمہارا دماغ چاٹنے سے بچ گیا۔ گھر پر رشید موجود ہے، میں وہ کیوں نہ چاٹوں، جس کے بارے میں قرآن شریف

میں بھی آیا ہے کہ لوگوں کے لیے شہد میں شفا ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم شہد چاٹو، ہم دونوں امی جان سے اجازت لے کر چلتے ہیں۔" فرزانہ نے کہا۔

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن جونہی وہ گھر سے باہر نکلے، ان کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔

○

پولیس کے آنے اور ضروری کارروائی تک انسپکٹر جمشید وہیں رکے رہے۔ یہاں تک کہ اندھیرا پھیل گیا۔ انہیں چنگیزی کی موت کا بہت افسوس تھا، کیونکہ اگر وہ یہاں نہ آتے تو چنگیزی کو موت کے گھاٹ نہ اتارا جاتا۔ وہ حیران بھی تھے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ کون لوگ ہیں جو امجد رؤف کو ختم کر دینا چاہتے ہیں اور جن کے لیے چنگیزی جیسے خطرناک لوگ کام کر رہے ہیں، اور پھر ہوشیار اتنے کہ وہ چنگیزی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو اسے ختم کر دیا گیا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ان کی راہ پر لگ چکے ہیں۔

وہ اس بستی سے باہر نکل کر موٹر سائیکل پر بیٹھ گئے۔ سڑک پر آتے ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے، وہ چوکنے ہو کر بیٹھ گئے اور موٹر سائیکل کی رفتار بڑھا دی۔ جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ ایک کار ان کے تعاقب میں ہے۔ کار کی رفتار انتہائی

تیز تھی اور موٹر سائیکل اس کی رفتار کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھی۔ درمیانی فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہو رہا تھا اور پھر انسپکٹر جمشید نے یہی مناسب سمجھا کہ رفتار آہستہ کر کے اسے آگے گذر جانے دیں، پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا موٹر سائیکل سڑک کے کنارے کرتے ہوئے رفتار ایک دم آہستہ کر دی۔ کار تیزی سے ان کی طرف آتی نظر آئی، انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کار کا ارادہ ٹکر مارنے کا ہے، انہوں نے فوراً موٹر سائیکل سڑک سے نیچے اتار لی۔ اس کے ساتھ ہی کار سے ایک فائر ہوا اور انہیں اپنے دائیں شانے میں آگ اترتی محسوس ہوئی... کار تیزی سے آگے نکل گئی۔ ان کے شانے سے خون تیزی سے بہنے لگا، لیکن انہوں نے موٹر سائیکل نہ روکی۔ اس کی رفتار تیز کرتے چلے گئے۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتے تھے۔ واقعات کی تیزی انہیں خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ اب انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا واسطہ جن لوگوں سے ہے، وہ کوئی معمولی مجرم نہیں ہیں، بہت تیز طرار اور چالاک لوگ ہیں۔ ایسے میں اگر وہ ہسپتال تک پہنچ جاتے اور وہاں پہنچتے ہی کوئی ہدایت دیے بغیر بے ہوش ہو جاتے تو ہسپتال والے ان کی حفاظت کے لیے کچھ نہ کر سکتے... اور ان پر ہسپتال میں دوبارہ حملہ ہو سکتا تھا، کیونکہ جن لوگوں نے ان پر فائر کیا تھا جب انہیں معلوم ہوتا کہ وہ بچ گئے ہیں تو وہ دوبارہ حملہ ضرور کرتے۔ گھر میں پہنچ جانے

کی صورت میں محمود، فاروق اور فرزانہ ان کی حفاظت کے لیے کافی تھے، انہیں کوئی ہدایت دینے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود ہی خطرے کو بھانپ لیتے۔

ان پر بے ہوشی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ موٹر سائیکل چلا رہے تھے۔ وہ اپنے ذہن کو بیدار رکھنے کے لیے پورا زور لگا رہے تھے۔ شانے میں آگ دہک رہی تھی، کپڑے خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود وہ اڑے جا رہے تھے۔ وہ بار بار سر کو جھٹک رہے تھے، تاکہ بے ہوش ہونے سے بچے رہیں مگر کب تک کمزوری ان پر چھانے لگی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنے لگا، ایسے میں بھی انہوں نے موٹر سائیکل نہ روکی اور عین اس وقت جب انہوں نے محسوس کیا، اب وہ بے ہوش ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے، انہوں نے گھر کا موڑ کاٹا اور موٹر سائیکل گھر کے عین سامنے پہنچ گئی۔

ادھر انہوں نے بریک لگایا، اور وہ موٹر سائیکل سے گر کر بے ہوش ہو گئے۔

چیخیں

محمود اور فرزانہ نے اپنے والد کو موٹر سائیکل سے گرتے دیکھا تو ان کے حلق سے چیخیں نکل گئی تھیں۔ فوراً ہی فاروق بھی باہر نکل آیا اور ان کے پیچھے بیگم جمشید۔ چاروں نے مل کر جلدی سے انہیں اٹھایا اور اندر لا کر پلنگ پر ڈال دیا۔

"فاروق! فوراً ڈاکٹر کو فون کرو اور پولیس کو بھی۔" محمود نے کہا اور خود انسپکٹر جمشید کے شانے سے قمیص سرکانے لگا... دو منٹ کے اندر ان کے شانے پر پٹی کس کر باندھ دی گئی تھی تاکہ مزید خون ضائع نہ ہو۔ فاروق فون کر کے اندر آچکا تھا۔

"ہمیں، تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دینی چاہئیں۔ حملہ آوروں کو اگر یہ معلوم ہو گیا کہ یہ بچ گئے ہیں تو شاید دوبارہ حملہ کریں۔" فرزانہ نے کہا۔

"اوہ! تم ٹھیک کہتی ہو۔" بیگم جمشید بولیں... اور چاروں نے مل کر دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں۔

"اب صدر دروازہ صرف ڈاکٹر یا پولیس کے لیے کھلے گا۔" محمود

نے کہا۔

وہ بے چینی کے عالم میں ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگے۔ آخر گھنٹی بجی۔

"فاروق تم جاؤ، دروازہ پوری طرح اطمینان کرنے کے بعد کھولنا اور ڈاکٹر یا پولیس کے اندر آجانے کے بعد اندر سے بند کر دینا۔"

"بہت بہتر!" فاروق نے کہا اور تیز تیز چلتا دروازے کی طرف چلا گیا۔

"کون ہے؟" اس نے دروازہ کھولے بغیر کہا۔

"ڈاکٹر! ابھی فون موصول ہوا تھا۔"

"آپ کا نام کیا ہے؟" فاروق نے پوچھا۔

"ڈاکٹر انصاری... آپ لوگوں کا فیملی ڈاکٹر۔"

اب شک کی کوئی وجہ نہیں رہی تھی، اس نے دروازہ کھول دیا، ڈاکٹر اپنے ایک اسسٹنٹ کے ساتھ اندر داخل ہوا، انہوں نے چہرے پر نقاب چڑھا رکھا تھا۔ فاروق نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ دونوں ڈاکٹر اس کے ساتھ اندر آئے، انہوں نے پٹی اتار کر زخم دیکھا۔

"گولی گوشت کو چھیدتے ہوئے نکل گئی ہے، ہڈی محفوظ ہے، میں پٹی کیے دیتا ہوں اور درد سے نجات کے لیے انجکشن دیے دیتا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ!" محمود نے کہا۔

"آپ انجکشن تیار کریں، میں پٹی کرتا ہوں۔" ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔

"او کے سر!"

ڈاکٹر پٹی تیار کرنے لگا اور اس کا اسسٹنٹ ایک سرنج میں دوا بھرنے لگا۔ سرنج پہلے تیار ہو گئی۔ اسسٹنٹ انجکشن دینے کے لیے آگے بڑھا... اچانک فرزانہ نے کہا:

"ذرا ٹھہریے ڈاکٹر... یہ آپ کون سا انجکشن دے رہے ہیں؟"

"کیوں بے بی۔ تم نے یہ کیوں پوچھا؟" اسسٹنٹ کی بجائے ڈاکٹر انصاری نے کہا اور تینوں چونک اٹھے۔

"حالات عجیب و غریب ہیں ڈاکٹر صاحب، ہمارے والد پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے جس سے وہ بچ گئے ہیں، اس لیے اس بات کا زبردست امکان ہے کہ حملہ آور دوبارہ کوشش کریں گے، کیا آپ دونوں اپنا نقاب ہٹا کر دکھائیں گے؟"

"کیا مطلب؟" ڈاکٹر چونکا۔

"میرا خیال ہے، آپ دونوں نقلی ڈاکٹر ہیں۔"

"ہاں! تمہارا خیال ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر نے کہا، ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا۔

وہ پستول کو دیکھ کر مسکرا اٹھے۔ انہیں مسکراتے دیکھ کر دونوں نقلی ڈاکٹر بہت حیران ہوئے، انہوں نے اپنے چہروں سے نقاب

نوچ ڈالے۔

"جلدی کرو راتھر... انجکشن لگا دو، تا کہ یہ مصیبت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔"

راتھر انجکشن لے کر آگے بڑھا، لیکن ایک تیز آواز نے اس کے قدم روک لیے:

"ناممکن!"

ناممکن کا یہ لفظ محمود نے ادا کیا تھا۔ آواز اس کے حلق سے گولی کی طرح نکلی تھی اور کمرے میں گونج کر رہ گئی تھی۔

"کیا مطلب!" راتھر نے حیران ہو کر کہا۔

"ہماری زندگیوں میں یہ ناممکن ہے کہ تم زہر کا انجکشن ہمارے والد کے بازو میں اتار دو۔"

"تو پھر —— تم کیا کر لو گے، کیا تمہارے خیال میں جارج کے ہاتھ میں نقلی پستول ہے۔"

"ہو گا اصلی —— لیکن تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔" فاروق نے بلند آواز میں کہا۔

"اگر تم میں سے کسی نے حرکت کرنے کی کوشش کی تو گولی ضرور چلے گی۔"

"پروا نہیں۔ یہ مت بھولو کہ پولیس آنے ہی والی ہو گی۔"

"ہم پولیس کے آنے سے پہلے اپنا کام ختم کر کے یہاں سے

نکل جائیں گے۔" جارج نے کہا اور راتھر کی طرف مڑا:

"راتھر! تم کھڑے منہ کیا تک رہے ہو، آگے بڑھو اور انجکشن لگا دو۔"

"اوہ ہاں۔ ضرور۔"

راتھر نے کہا اور ایک قدم آگے بڑھایا، لیکن فوراً ہی محمود نے اپنی جگہ سے بجلی کی سی تیزی سے چھلانگ لگائی اور اس کے راستے میں آ گیا۔ جارج نشانہ ہی لیتا رہ گیا۔

"خبردار!" اس نے چلا کر کہا، لیکن اتنی دیر میں محمود راتھر کے سرنج والے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی ہڈی رسید کر چکا تھا، اس کے منہ سے گھٹی گھٹی ایک چیخ نکلی، ساتھ ہی سرنج فرش پر گر کر چور چور ہو گئی، اور جارج نے فائر جھونک مارا، لیکن گولی راتھر کا سینہ چھیدتی ہوئی نکل گئی۔ اس کے حلق سے ایک تھرا دینے والی چیخ نکلی اور وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ اسی وقت پستول کی نالی کا رخ محمود کی طرف ہو گیا، لیکن فاروق اور فرزانہ نے ایک ساتھ اپنی جگہ سے چھلانگیں لگائیں اور جارج کی کمر سے ٹکرائے، وہ اندھے منہ گرا۔ بس پھر کیا تھا، تینوں ایک ساتھ اسے چھاپ بیٹھے۔ بیگم جمشید نے آگے بڑھ کر پستول اس کے ہاتھ سے چھین لیا...

اب تینوں لاتوں اور مکوں سے اس کی خاطر تواضع کر رہے تھے اور اس کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ ابھی

یہ کھیل جاری تھا کہ ایک بار پھر دروازے کی گھنٹی بجی اور وہ چونک اُٹھے۔

"اب پولیس والے آئے ہوں گے۔" محمود نے کہا۔

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اصلی ڈاکٹر انصاری آئے ہوں۔"

"خیر... دروازہ کھولنے سے پہلے اس مرتبہ اچھی طرح اطمینان کر لینا۔" محمود نے فاروق سے کہا۔

انہوں نے نقلی ڈاکٹر کو چھوڑ دیا۔ پستول اب محمود نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور اس کا رُخ اسی کی طرف تھا۔

"یہ نہ سمجھنا کہ مجھے پستول چلانا نہ آتا ہو گا، اس گھر کے ہر فرد کو پستول چلانے میں مہارت حاصل ہے۔" اس نے غرّا کر کہا اور فاروق پھر دروازے کی طرف چلا گیا۔

"کون ہے۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔

"پولیس... یہاں سے فون کیا گیا تھا، انسپکٹر صاحب خیریت سے تو ہیں۔"

"وہ زخمی ہیں، آپ اپنا مکمل تعارف کرائیے، کیونکہ آپ سے پہلے ایک نقلی ڈاکٹر اپنے ساتھی کے ساتھ اندر داخل ہو کر انہیں ختم کرنے کی کوشش کر چکا ہے۔"

"اوہ! میرا نام رفیق خان ہے، سب انسپکٹر ہوں اور آپ کے علاقے کے تھانے میں تعینات ہوں۔"

"یہ بات تو ایک نقلی سب انسپکٹر بھی کہہ سکتا ہے۔"

"تو پھر... میں کیسے اطمینان کراؤں۔"

"اس سے پہلے بھی آپ ہمارے گھر آ چکے ہیں۔"

"ہاں! ایک ڈیڑھ ماہ پہلے بھی آنا پڑا تھا، اس وقت بھی آپ نے فون کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے، میں دروازہ کھول رہا ہوں۔" فاروق نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

اس بار سب انسپکٹر اور پولیس کانسٹیبل نقلی نہیں تھے۔ فاروق نے انہیں تو اندر بھیجا اور خود ایک اور ڈاکٹر کو فون کرنے چلا گیا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ ڈاکٹر پہنچ گیا۔ اس دوران سب انسپکٹر رفیق خان نقلی ڈاکٹر کو گرفتار کر چکا تھا اور اس کے ساتھی کی لاش کو اُٹھوا چکا تھا... لیکن خود ابھی وہیں موجود تھا۔ ڈاکٹر آیا اور پٹی کر کے چلا گیا۔ اس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ رات کے گیارہ بجے کے قریب انہیں ہوش آ جائے گا اور اگر نہ آئے تو اسے دوبارہ بلا لیا جائے۔

انہوں نے گھڑیوں کی طرف دیکھا، ابھی صرف ساڑھے دس بجے تھے۔ عین اس وقت انہیں یاد آیا، وہ تو انور کریم کی مدد کے لیے جانے والے تھے کہ یہ حادثہ پیش آ گیا۔ محمود اور فاروق کی نظریں فرزانہ پر جم گئیں۔

"انور کریم صاحب کا اب کیا کریں۔" محمود نے

"یہاں کے حالات اب ہمارے کنٹرول میں ہیں۔ اگر آدھ گھنٹے بعد ابا جان ہوش میں آگئے اور انہوں نے اجازت دے دی تو ہم وہاں ہو آئیں گے۔" فرزانہ بولی۔

"ٹھیک ہے۔ اگرچہ اب رات کے گیارہ بجے وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" فاروق نے کہا۔

"یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کوئی فائدہ نہیں۔" فرزانہ نے منہ بنا کر کہا۔ "انہیں اگر کوئی خطرہ تھا تو وہ ہمارا انتظار تو کر نہیں رہا ہوگا۔"

"خیر..... دیکھیں گے۔"

ٹھیک گیارہ بجے انسپکٹر جمشید کو ہوش آگیا۔ انہوں نے سب کو مسکرا کر دیکھا... اپنے بارے میں مختصر طور پر بتایا اور پھر ان سے گھر میں پیش آنے والے حادثے کے بارے میں سنا۔ محمود اور فاروق نے شام کے واقعے کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا اور فرزانہ کا خیال بھی بتایا۔ سب کچھ سننے کے بعد انسپکٹر جمشید بولے:

"فرزانہ کا خیال بالکل ٹھیک ہے، انور کریم سخت خطرے میں ہیں، تم تینوں فوراً وہاں پہنچو۔"

"لیکن ابا جان! ہم میں سے ایک کا یہاں رہنا بھی تو ضروری ہے۔" محمود نے کہا۔

"میری فکر نہ کرو، اب میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"جی بہتر... تو پھر ہم چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے کہا اور سب انسپکٹر کی طرف متوجہ ہوتے: "اب آپ بھی جا سکتے ہیں، کل کسی وقت آکر بیان لکھیے گا۔"

"جی بہتر!"

تھوڑی دیر بعد وہ تینوں انور کریم کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ رات کے وقت انہیں کوئی رکشہ یا ٹیکسی ملنے کی اُمید نہیں تھی، لیکن رفیق خان نے ان کی مشکل حل کر دی اور وہ جیپ میں انہیں اس سڑک پر چھوڑ کر آگے بڑھ گیا جس پر جب کر انور کریم کی کوٹھی تھی، انہیں صرف دو فرلانگ پیدل چلنا پڑا، پھر جونہی وہ کوٹھی کے سامنے پہنچے، ٹھٹھک کر رہ گئے، انہوں نے ایک عجیب و غریب چیخ کی آواز سُنی۔

○

رومال اڑانے والے کا نام تابانی تھا، اس نے رومال لاکر مونچھوں والے کو دیا تھا جو اس کا باس تھا۔ باس اس کے جانے کے بعد ایک سیاہ سیال سے بھری بوتل لے کر تاروں سے بنے باڑے میں گیا تھا جہاں ایک بہت بڑا کتا موجود تھا، اس نے بوتل کا سیال اسے پلا دیا تھا اور کتا گہری نیند سو گیا تھا۔ اسے سوتا چھوڑ کر مونچھوں والا واپس اپنے کمرے میں آگیا تھا۔

ٹھیک چار گھنٹے بعد وہ پھر اپنے کمرے سے نکل کر باڑے

کی طرف آیا۔ اب اس نے سیاہ لباس پہن لیا تھا۔ تالا کھول کر اندر داخل ہوا اور کتے کی زنجیر کھولی، کتا اب جاگ گیا تھا، اسے لے کر وہ باڑے سے باہر نکلا۔ گیراج میں کھڑی کالی کار کا دروازہ کھولا، کتے کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار سٹارٹ کر دی۔۔۔ اب کار تیز رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ کتا نہایت اطمینان سے بیٹھا تھا۔ کار آدھ گھنٹے تک چلتی رہی اور پھر ایک جگہ رُک گئی۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے، سڑکیں سنسان پڑی تھیں، کار روک کر وہ نیچے اُترا، پچھلا دروازہ کھولا اور کتے کے گلے کے پٹے سے زنجیر الگ کر دی۔ کتا باہر نکل آیا۔ مونچھوں والے آدمی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک رومال نکالا۔ یہ وہی رومال تھا جو اسے تابانی نے لا کر دیا تھا۔ اس نے رومال کتے کے آگے ڈال دیا۔ چند لمحے تک کتا رومال کو سونگھتا رہا، پھر اس کے حلق سے ایک غراہٹ نکلی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، زمین کو سونگھا اور پھر تیر کی طرح ایک کوٹھی کی طرف گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ایک اونچی چھلانگ لگائی اور کوٹھی کی دیوار پھاند گیا۔ اسے دیوار پھاندتے دیکھ کر کار والا واپس کار میں بیٹھ گیا، اس نے کار سٹارٹ کر دی اور واپس اسی سمت میں چلا گیا جس طرف سے آیا تھا۔ کتے کے پاؤں زمین سے لگے تو وہ اٹھ کر

دروازے کی طرف لپکا، دروازہ لکڑی کا تھا اور اندر سے بند تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک بار پھر اُونچی چھلانگ لگائی۔ یہ چھلانگ اسے ایک کارنس پر لے آئی، یہاں سے اس نے سامنے کی کھڑکی کے چھجے پر چھلانگ لگائی۔۔۔۔ اور اس کھڑکی کے چھجے سے مخالف سمت کے ایک روشن دان پر آیا، روشن دان میں اس نے اپنا اگلا دھڑ داخل کر دیا اور نیچے جھانکا۔ کمرے میں بلب جل رہا تھا، پلنگ پر ایک آدمی لیٹا تھا، اس نے وہاں سے نیچے چھلانگ لگائی۔

دھم کی آواز بہت خوفناک تھی۔ سویا ہوا آدمی جاگ اٹھا۔ یہ انور کریم تھا اور پھر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے سامنے ایک خوفناک کتا زبان نکالے ہانپ رہا تھا، بجلی کی سی تیزی سے انور کریم نے تکیے کے نیچے سے پستول نکالا اور فائر جھونک مارا، کتا اچھلا اور گولی اس کے نیچے سے نکل گئی، اس نے حیرت انگیز پھرتی دکھائی تھی۔ انور کریم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے پے درپے پانچ فائر اور کیے، لیکن کتا بجلی کی طرح کوندتا چلا گیا۔

اب پستول خالی ہو چکا تھا، انہیں یوں لگا جیسے کتا قہقہے لگا رہا ہو، اور پھر اس نے ایک چھلانگ لگائی اور ان کے اوپر آ رہا۔ انور کریم کے منہ سے نکلنے والی چیخ بہت بھیانک تھی، انہوں نے دونوں ہاتھوں سے کتے کو پرے دھکیلنے کے لیے اپنا پورا

زور لگا دیا، خوب ہاتھ پاؤں مارے، لیکن کب تک... کتا بہت طاقت ور تھا... اور حد درجے پھرتیلا بھی... اس کے بدن میں تو جیسے بجلی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔

اور پھر کمرے میں ایک لرزہ خیز چیخ گونجی جس نے آس پاس کے لوگوں کے دل دہلا دیے۔ انور کریم کے پڑوسیوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ باہر نکل کر حالات معلوم کرنے کی بجائے خوف اور دہشت کے مارے بستروں میں دبک گئے۔

یہ چیخ بیرونی دروازے پر کھڑے پولیس کے آدمیوں نے بھی سنی اور وہ بوکھلا کر اندر کی طرف بھاگے۔ تھوڑی دیر بعد ملازم کے ساتھ وہ انور کریم کے کمرے کے دروازے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے...... لیکن وہ دروازہ تو اندر سے بند تھا...... انہوں نے پہلے تو دروازہ دھڑ دھڑایا لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو دروازے پر ایک ساتھ ٹکریں مارنا شروع کیں، یہاں تک کر دروازہ دھڑام سے دوسری طرف گر گیا۔ وہ اندر داخل ہوئے اور پھر جب ان کی نظریں انور کریم کے بستر پر پڑیں تو ان سب کے منہ سے خوف اور دہشت میں ڈوبی چیخیں اور بھی بلند آواز میں نکلیں۔

پڑوسی ایک بار پھر تھرا اُٹھے۔

دوسرا نشان

اندر سے آنے والی چیخیں ایسی نہیں تھیں کہ وہ باہر ہی کھڑے سوچتے رہ جاتے۔ وہ بے تحاشہ دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔ دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے اندر پہنچ گئے، انہیں ایک کمرے کا دروازہ ٹوٹا نظر آیا... وہ اس میں داخل ہوئے۔ یہاں پولیس مین اور گھر کے ملازم تو موجود تھے ہی، انور کریم کی بیٹی اور بیگم بھی موجود تھیں۔ وہ بُت بنے دہشت زدہ انداز میں بستر کی طرف دیکھ رہے تھے، پھر جونہی ان کی نظریں بستر پر پڑیں، وہ دھک سے رہ گئے۔ انہوں نے اتنا خوفناک منظر اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بستر پر انور کریم کی لاش پڑی تھی۔ اگر یہ لاش عام لاشوں جیسی ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی، لیکن یہ لاش... توبہ... اس کا گلا ادھڑا پڑا تھا، یوں لگتا تھا جیسے کسی شیر یا ریچھ نے اپنے دانتوں سے گلا ادھیڑ ڈالا ہو۔

"فاروق! فوراً پولیس کو فون کر دو۔" محمود نے بوکھلا کر کہا۔

اس کی آواز سن کر کمرے میں موجود تمام آدمی اس طرح چونکے جیسے اب تک سکتے کے عالم میں رہے ہوں، اور پھر کمرے میں انور کریم کی بیٹی عارفہ کی دھاڑیں گونج اٹھیں۔ ان کی بیگم فرش پر گر کر زور زور سے رونے لگیں۔

"لیکن پولیس تو یہاں پہلے ہی موجود ہے۔" فاروق نے کہا۔

"ان میں ماہرین نہیں ہیں، نہ ان کے ساتھ ویگن ہے، فوٹوگرافروں کی موجودگی سب سے زیادہ ضروری ہے۔ موقعے کی تصاویر لینا ہوں گی۔" محمود نے کہا۔ فرزانہ کے تو ہوش اڑے ہوئے تھے، وہ عارفہ کو سنبھالنے کی کوشش میں خود بھی رونے کے قریب تھی...

"افسوس! ہم اباجان کو فون کر کے یہاں نہیں بلا سکتے۔" محمود نے کہا۔ "بہت سے اندازے لگا سکتے تھے... مگر اوہ!" محمود کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔

"مگر اوہ کیا؟" فرزانہ نے چونک کر کہا۔

"تم نے پہلے ہی خطرے کا اندازہ لگا لیا تھا۔ آخر رومال کی چوری سے تم کس نتیجے پر پہنچی تھیں؟"

"یہ وقت ایسی باتوں کے لیے مناسب نہیں۔" فرزانہ نے اسے گھورا اور وہ خاموش ہو گیا۔

آخر پولیس اور ماہرین آ پہنچے۔ وہ بھی لاش کو دیکھ کر خوف سے لڑکھڑا گئے، مارے دہشت کے ان کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔

ضروری کارروائی شروع ہوئی اور اس میں دو اڑھائی گھنٹے لگ گئے۔ بیگم انور کریم اور عارفہ رو رو کر نڈھال ہو چکی تھیں، فرزانہ، محمود اور فاروق نے انہیں ان کے کمرے میں پہنچایا، پھر فرزانہ نے کہا:

"محمود! میں رات تک ان کے ساتھ رہوں گی، صبح گھر آؤں گی، تم دونوں البتہ گھر چلے جاؤ، صبح آنٹی کے عزیز اور رشتے دار آ جائیں گے تو میں آ جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" دونوں نے ایک ساتھ کہا اور پھر رخصت ہونے کے لیے کمرے سے نکل گئے، کچھ سوچ کر فرزانہ بھی ان کے پیچھے چلی آئی اور بیرونی دروازے کے قریب آ کر ان سے بولی:

"میں اسی لیے آئی ہوں کہ تم رات بھر الجھن میں مبتلا نہ رہو۔ جب کسی شخص کا رومال یا کپڑے کا کوئی ٹکڑا اس طرح خطرہ مول لے کر اڑایا جاتا ہے تو ایک ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اور وہ یہ اسے کسی بلڈ ہاؤنڈ کتے کے آگے ڈال دیا جاتا ہے، اس کتے کی یہ خصوصیت ہے کہ رومال کی بو سونگھ کر اس آدمی پر حملہ آور ہوتا ہے جس کا وہ رومال ہوتا ہے۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے... ان کا واسطہ آج تک کسی کیس کے دوران اس قسم کے واقعے سے نہیں پڑا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ اس بات سے بے خبر تھے، لیکن شاید فرزانہ نے کہیں پڑھ پایا تھا۔ وہ فرزانہ سے رخصت ہو کر باہر نکل آئے۔ رات

کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

"کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ ہم رات یہیں گزار لیتے۔" فاروق نے کہا۔

"اگر ابا جان زخمی نہ ہوتے تو ہم ضرور یہیں ٹھہرتے۔" محمود بولا۔

"آخر وہ کون ہے جس نے ایک کتے کے ذریعے انور کریم کی جان لی ہے... اور کیا وہی شخص امجد رؤف کی جان بھی لینا چاہتا ہے، مگر نہیں، اس نے تو دن دہاڑے امجد رؤف پر حملہ کرایا تھا۔ اگر وہ کتے سے کام لے سکتا ہے تو پھر اسے فائر کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا مطلب ہے، وہ اور شخص ہے۔" فاروق سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہتا چلا گیا۔

"یار میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے، کیوں نہ ہم کل امجد رؤف کو دیکھیں۔" اچانک فاروق نے کہا۔

"کیوں، اسے دیکھ کر کیا ملے گا؟"

"اگر امجد رؤف کے چہرے پر بھی ایک تکونا سرخ رنگ کا نشان ہو تو کیسی رہے؟"

"تو کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ شخص تکونے نشان والوں کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اول تو یہ بات ہی ناممکن ہے کہ کسی اور کے چہرے پر ویسا نشان ہو، دوسرے یہ کہ بھلا اسے اس نشان سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔" محمود نے کہا۔

"سوال تو یہ ہے کہ اگر امجد رؤف کے چہرے پر ویسا نشان

ہو تو کیا ہوگا؟" فاروق نے کہا۔

"وہی ہوگا جو خدا کو منظور ہوگا، تم اس نشان کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"کیا خیال ہے، تمہارے پیچھے پڑوں؟"

"میرے پیچھے پڑ کر بھی تمہیں کچھ نہیں... ارے یہ سڑک پر کیا پڑا ہے؟" محمود نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کی نظریں چند گز اور سڑک پر جم گئی تھیں اور قدم رک گئے تھے۔ فاروق بھی رک گیا۔ اس جگہ روشنی بہت مدھم تھی اور اس مدھم سی روشنی میں انہیں ایک چھوٹی سی چیز پڑی نظر آ رہی تھی۔

"مجھے تو یہ کوئی مڑا تڑا کاغذ معلوم ہوتا ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ہو سکتا ہے، یہ کاغذ ہی ہو، کیونکہ ہوا آج ساکن ہے... آؤ آگے چل کر دیکھیں۔"

"یہ تو ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی چھوٹا سا سانپ ہو جو جلیبی کی صورت بیٹھا ہو۔"

"اگر یہ سانپ ہے تو ہمارے ہاتھوں مارا جائے گا بے چارہ۔" محمود بولا۔

"اگر سانپ پر اتنا ہی ترس آ رہا ہے تو اسے ہار بنا کر گلے میں ڈال لینا۔" فاروق نے منہ بنایا اور قدم آگے بڑھایا۔ محمود نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ آخر دونوں اس چیز کے نزدیک پہنچ گئے۔

"ارے! یہ تو کوئی رومال ہے!" محمود کے منہ سے نکلا۔

"ارے باپ رے... پھر رومال سے واسطہ آ پڑا! کیا اس کیس میں صرف رومال ہی ہمارے سامنے آتے رہیں گے!" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"چلو اسے اٹھاؤ!" محمود نے کہا۔

"کیوں! میں کیوں اٹھاؤں؟" فاروق نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"تم تو اس سے اس طرح ڈر رہے ہو جیسے یہ کوئی بم ہو۔"

"کیا خبر! اس رومال میں بم ہی ہو!" فاروق نے کہا۔

"چھوڑو یار... کبھی کبھی تم بالکل بزدل بن جاتے ہو!" محمود نے جھلا کر کہا اور رومال اٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔

"چلو ہر وقت بزدل نہیں بنتا؟" فاروق مسکرایا۔

اسی وقت محمود نے جھک کر رومال اٹھا لیا۔ اس میں سے ہلکی سی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ دونوں نے رومال کو بغور دیکھا اور چلتے ہوئے کھمبے کے نیچے پہنچ گئے، یہاں روشنی زیادہ تھی، رومال صاف نظر آنے لگا۔

"ارے!" محمود زور سے چونکا۔

"کیا ہوا، رومال نے کاٹ کھایا ہے کیا؟"

"یہ رومال... تو وہی لگتا ہے..." محمود کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"کیا مطلب ___ کون سا رومال!"

"وہی جسے انور کریم نے پتھر کے بنچ پر رکھ دیا تھا اور وہ اچکا اسے لے اڑا تھا۔"

"اوہ!" فاروق کی آنکھیں مارے حیرت کے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

○

گھر پہنچے تو انسپکٹر جمشید جاگ رہے تھے، بیگم جمشید ان کی چارپائی کے قریب کرسی پر بیٹھی تھیں۔ وہ انہی کا انتظار کر رہے تھے۔

"فرزانہ کہاں رہ گئی؟" ان کے منہ سے نکلا۔

"اسے وہیں رکنا پڑ گیا ہے، صبح آ جائے گی!" محمود نے کہا۔

"کیا مطلب؟ کیا وہاں کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے؟" انسپکٹر جمشید نے چونک کر کہا۔

"جی ہاں!" یہ کہہ کر محمود نے ساری باتیں تفصیل سے کہہ سنائیں۔ انسپکٹر جمشید دھک سے رہ گئے۔

"ابا جان! کیا امجد رؤف کی دائیں آنکھ کے نیچے کوئی سرخ رنگ کا تکونا نشان بھی ہے؟" اچانک فاروق ان سے پوچھ بیٹھا اور محمود اسے گھورنے لگا۔

"کیوں! تم نے یہ کیوں پوچھا؟" انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

"اس لیے کہ انور کریم کی دائیں آنکھ کے نیچے ایک سرخ رنگ

کا تکونا نشان تھا"

"تو پھر اس سے کیا ہوتا ہے... امجد رؤف کے چہرے پر ویسا نشان کیوں ہونے لگا؟" انہوں نے بھی فاروق کو گھورا۔

"اس کی کوٹھی کے دروازے پر بھی تو کھڑکھڑاہٹ ہوتی ہے، کوئی رات کے وقت اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس کی چار دیواری بہت اونچی ہے اور خاردار تاروں کی باڑ بھی لگی ہے، شاید اسی لیے کتے کا بس نہیں چلتا، چونکہ انور کریم کو کتے کے ذریعے ہلاک کروایا گیا ہے اور اس کے چہرے پر تکونا سرخ نشان موجود تھا، اور امجد رؤف کے گھر میں بھی کتا داخل ہونے کے لیے زور لگاتا ہے، اس لیے میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ کہیں اس کے چہرے پر بھی تو ویسا نشان نہیں ہے۔" فاروق کہتا چلا گیا۔

"میں نے اپنی زندگی میں اتنی بے تکی بات کبھی نہیں سنی۔" انسپکٹر جمشید کے کچھ بولنے سے پہلے محمود نے کہا۔

"چلو! آج تو سن لی ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"بھئی بات یہ ہے کہ امجد رؤف چند منٹ کے لیے میرے دفتر میں آیا تھا، میں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ بھی نہیں لیا، کیونکہ اس سے پہلے بھی ہماری کئی مرتبہ ملاقات ہو چکی ہے، ویسے میرا خیال تو یہی ہے کہ اس کے چہرے پر ایسا کوئی نشان نہیں

ہے... تم یہ بتاؤ، انور کریم کے چہرے پر سرخ نشان قدرتی تھا یا مصنوعی؟" انہوں نے پوچھا۔

"مجھے تو وہ سو فیصد قدرتی نظر آیا تھا۔" محمود بولا۔

"اور مجھے پچاس فیصد قدرتی اور پچاس فیصد نقلی۔" فاروق نے ہنس کر کہا۔

"خیر... دیکھیں گے... کل اگر میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو امجد رؤف سے ملنے جاؤں گا... بے شک تم بھی ساتھ چلنا اور اس وقت دیکھ لینا، نشان ہے یا نہیں۔"

"بہت بہت شکریہ!"

"مجھے تو عارفہ اور اس کی امی کا خیال آ رہا ہے رہ رہ کر... ان دونوں کا کیا حال ہو گا۔" بیگم جمشید نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا۔

"ہاں! تم صبح وہاں ہو آنا۔" انسپکٹر جمشید نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"آخر وہ کون درندہ ہے جس نے انور کریم کو اس طرح ہلاک کروایا ہے۔"

"یہ ہمیں معلوم کرنا ہو گا، کسی کتے کے ذریعے ختم کرانے کا مقصد یہ ہے کہ مجرم کا سراغ نہ لگایا جا سکے، ظاہر ہے اس طرح اصل قاتل تو سامنے آتا ہی نہیں، گھر بیٹھے ہی سارا کام کر لیتا ہے۔"

"لیکن ابا جان! کتّے کو تو اسے انور کریم کی کوٹھی تک لانا ہی پڑا ہو گا۔"

"ہاں! کوٹھی کے آس پاس لا کر اور وہ رومال سونگھا کر چھوڑ دیا گیا ہو گا اور اس کے بعد کتّے نے اپنا راستہ خود تلاش کیا ہو گا، بلکہ بعض بلڈ ہاؤنڈ کتّے تو اتنی تیز ناک والے ہوتے ہیں کہ بہت دور سے ہی انہیں اپنے شکار کی بُو آنے لگتی ہے۔"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے.... ہمیں انور کریم کی کوٹھی سے کچھ فاصلے پر وہ رومال پڑا ملا ہے جو شام پارک سے اٹھایا گیا تھا۔" محمود نے انہیں بتایا۔

"اوہ....." انسپکٹر جمشید چونکے پھر انہوں نے سرد آواز میں کہا:

"دھیان رکھنا، ہمارے گھر کا کوئی کپڑا کسی کے ہاتھ نہ لگنے پائے۔ کوئی رومال یا استعمال کا کوئی دوسرا کپڑا.... گھر کا دروازہ ہر وقت بند رہے... کیونکہ بعض اوقات کتّے کو اس طرح بھی تربیت دی جاتی ہے کہ کپڑے کے ٹکڑے کے بغیر ہی اسے شکار کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے اور وہ اس پر ٹوٹ پڑتا ہے۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔

دوسرے دن صبح سویرے ڈاکٹر نے آ کر زخم کا معائنہ کیا، دوبارہ پٹی کی، انہیں انجکشن دیا اور کم از کم ایک ہفتے تک آرام کرنے کی ہدایت دی۔

"ایک ہفتہ... لیکن ڈاکٹر صاحب یہ تو آپ نے بہت لمبا عرصہ بتا دیا، میں اتنے دنوں تک بستر پر نہیں لیٹا رہ سکتا۔" انہوں نے گھبرا کر کہا۔

"اگر آپ نے اس سے پہلے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو زخم خراب ہونے کا ڈر ہے۔"

"خیر دیکھا جائے گا۔" انہوں نے کہا۔

ڈاکٹر گیا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ محمود نے کہا:

"یہ گھنٹی فرزانہ کی تو نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں! کوئی ملاقاتی آیا ہے، ظاہر ہے، میرے زخمی ہونے کی خبر اخبار میں آ چکی ہو گی اور بیگم تم لمبے چوڑے ناشتے کی تیاری شروع کر دو، کیونکہ..."

ان کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ اس مرتبہ گھنٹی لمبے وقفے تک بجی تھی، آخر محمود اٹھ کر دروازے پر پہنچا، اس نے پوچھا: "کون صاحب ہیں؟" "میں ہوں امجد رؤف!"

"اوہ!" محمود چونک اٹھا، دوسرے ہی لمحے اس نے دروازہ کھول دیا اور سب سے پہلے اس کی نظر آنے والے کی دائیں آنکھ کے نیچے پڑی۔ دوسرا لمحہ چونکا دینے والا تھا۔

امجد رؤف کی آنکھ کے نیچے بھی ایک سرخ رنگ کا ٹکونا نشان موجود تھا۔

عجیب لمحہ

امجد رؤف کو دیکھ کر انسپکٹر جمشید کو بھی حیرت ہوئی، فاروق پہلے تو بھونچکا رہ گیا، اور پھر اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ناچنے لگی۔ اس کا خیال سو فیصد درست نکلا تھا، امجد رؤف کے چہرے پر بھی سرخ تکونا نشان موجود تھا۔

"آپ کیوں چلے آئے۔ جب کہ آپ ہر طرف سے خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔"

"مجھے تمام رات نیند نہیں آئی... صبح اخبار میں آپ کے زخمی ہونے کی خبر پڑھی... تو اور فکر مند ہوا اور یہاں دوڑا آیا، کیونکہ آپ میری ہی وجہ سے زخمی ہوئے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"نہیں! یہ تو میری قسمت میں لکھا تھا۔ فاروق... کیا اخبار آگیا ہے؟" انہوں نے امجد رؤف سے کہنے کے بعد فاروق سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ ابھی تک نہیں آیا۔"

"شاید آپ کے ہاں اخبار بہت جلد آجاتا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔ امجد رؤف نے چونک کر انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا،

پھر بولا:

"ہاں! ہماری طرف تو اخبار کبھی کا آچکا ہے۔" اس کے منہ سے نکلا۔

انسپکٹر جمشید نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی، پھر محمود سے کہا:

"اکرام کو فون کر کے اسے یہاں آنے کے لیے کہو، میں اس کے ذمے کچھ کام لگانا چاہتا ہوں۔"

"جی اچھا!" محمود نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

بیگم جمشید باورچی خانے جا چکی تھیں۔ محمود کے جانے کے بعد انسپکٹر جمشید امجد رؤف سے بولے:

"رات تو کسی نے آپ کی کوٹھی میں گھسنے کی کوشش نہیں کی۔"

"جی نہیں۔ رات سکون رہا، یہ اور بات ہے کہ میں سو نہیں سکا۔"

"آپ انور کریم کو تو جانتے ہوں گے۔" اچانک انہوں نے پوچھا۔

"بہت اچھی طرح۔ کیوں کیا بات ہے؟"

"کیا آپ نے اس کے متعلق اخبار میں نہیں پڑھا؟" انسپکٹر جمشید نے حیرت زدہ لہجے میں کہا، کیونکہ اگر اس نے ان کے زخمی ہونے کی خبر پڑھی تھی تو انور کریم کے بارے میں بھی ضرور پڑھا ہوگا۔

"میں نے اخبار سرسری نظر سے دیکھا تھا... اور یہ ایک اتفاق تھا کہ سب سے پہلے آپ کے زخمی ہونے کی خبر پر نظر پڑی بس

میں اخبار پھینک کر یہاں چلا آیا۔"

"انور کریم آپ کے رشتے دار تو نہیں تھے؟"

"بالکل نہیں۔" اس نے فوراً کہا۔

"تب پھر یہ کس قدر عجیب بات ہے... بلکہ حیرت انگیز ترین کہہ سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں نکلا۔

"کونسی بات؟" امجد رؤف انہیں بغور دیکھنے لگے۔

"آپ نے کبھی اپنی دائیں آنکھ کے نیچے سرخ تکونے نشان پر دھیان دیا ہے؟" انہوں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" امجد رؤف بڑے زور سے چونکے۔

"کیا یہ نشان پیدائشی ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"آپ کس نشان کی بات کر رہے ہیں؟" امجد رؤف نے حیران ہو کر کہا۔

"اس نشان کی جو آپ کی دائیں آنکھ کے نیچے موجود ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ اس نشان سے بے خبر ہوں؟"

"لیکن میرے چہرے پر ایسا کوئی نشان نہیں۔" انہوں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"فاروق... آئینہ لے آؤ۔" وہ فاروق کی طرف دیکھے بغیر بولے۔

"جی اچھا!" فاروق کی آواز میں بھی حیرت تھی، کیونکہ یہ ایک عجیب ترین بات تھی... امجد رؤف اس نشان کے بارے میں بے خبر ہونے

کا دعویٰ کر رہا تھا جب کہ انہیں وہ نشان بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔

جلد ہی فاروق آئینہ لے کر اندر داخل ہوا۔ اس نے آئینہ امجد رؤف کے ہاتھ میں دے دیا، انہوں نے دیکھا، امجد رؤف کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے تھے، چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ پھر جونہی وہ آئینہ چہرے کے سامنے لائے، ان کے منہ سے ایک دل خراش چیخ بلند ہوئی، اور وہ کرسی سے لڑھک کر فرش پر آ رہے... فرش پر گرتے ہی ان کا جسم بے سُدھ ہو گیا۔

وہ بوکھلا اُٹھے۔ اسی وقت محمود اندر داخل ہوا اور ساتھ ہی دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ انداز فرزانہ کا تھا۔

O

"ارے! انہیں کیا ہوا؟" محمود کے منہ سے نکلا۔

"جاؤ، پہلے فرزانہ کے لیے دروازہ کھول دو اور ساتھ ہی ڈاکٹر کو بھی فون کر آؤ... واقعات حد درجے پر اسرار ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، یہ ہو کیا رہا ہے؟"... انہوں نے جلدی جلدی کہا اور محمود دوبارہ کمرے سے نکل گیا۔ اتنے میں بیگم جمشید بھی وہاں آ گئیں۔ ان کے کانوں تک امجد رؤف کی چیخ پہنچ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد فرزانہ اندر داخل ہوئی۔ فاروق، فرزانہ اور بیگم جمشید نے مل کر امجد رؤف کو دوسری چارپائی پر لٹا دیا۔ فاروق نے ان کی آنکھوں پر سے پپوٹے اٹھا کر دیکھے، دل کی حرکت

محسوس کی اور پھر نبض دیکھی۔

"یہ تو مکمل طور پر بے ہوش ہیں۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"ہوں! فاروق اس کیس کے ہیرو تم ہو۔" اچانک انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"جی کیا مطلب... میں کیسے ہیرو ہو گیا؟"

"یہ خیال سب سے پہلے تمہارے ذہن میں آیا تھا کہ کہیں امجد رؤف کے چہرے پر بھی تکونا سرخ نشان نہ ہو۔"

"لیکن نشان موجود ہونے سے کون سا یہ کیس حل ہو گیا ہے۔" اس نے مایوس ہو کر کہا۔

"ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے... جب ہم بیٹھ کر حالات اور واقعات کی کڑیاں ملائیں گے۔ تو کیس بھی حل ہو ہی جائے گا..." انہوں نے کہا، اسی وقت محمود اندر داخل ہوتا نظر آیا۔

"اکرام کو فون کر دیا؟"

"جی ہاں! وہ پہنچ رہے ہیں۔"

"کیا ہمارا اخبار آ گیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی... ابھی نہیں، آج آپ بار بار اخبار کے متعلق کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"بھئی آخر اس میں میرے زخمی ہونے کی خبر چھپی ہو گی۔" وہ مسکرائے۔

ایک بار پھر گھنٹی بجی۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو وہاں پوری فوج موجود تھی۔ وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے... اس فوج میں پروفیسر داؤد اور ان کی بیٹی شائستہ، خان رحمان، ان کی بیوی شہناز بیگم، بچے حامد، سرور اور ناز اور ان کے علاوہ اکرام بھی تھا۔

"کیسا ہے جمشید۔" سب سے پہلے پروفیسر داؤد بولے۔

پھر وہ اندر داخل ہوئے۔ انسپکٹر جمشید کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں ایک کی بجائے دو آدمی پڑے تھے۔

"ارے! یہ اپنے ساتھ کسی اور کو بھی بے ہوش کر لیا۔" خان رحمان کے منہ سے نکلا۔

"لیکن میں بے ہوش کب ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"اچھا اب تفصیل سے بتاؤ... کیا ہوا، کیوں ہوا، کیسے ہوا، جس نے یہ کیا، ہم اس کی ہڈیاں تک چبا جائیں گے۔" خان رحمان کہتے چلے گئے۔

"انکل آپ میں کسی آدم خور کی روح تو نہیں آ گئی۔" فاروق بولے بغیر نہ رہ سکا اور وہ مسکرا پڑے، خان رحمان نے تو فاروق کی کمر پر ایک زوردار دھپ رسید کر دیا، لیکن ہوا یہ کہ فاروق ایک دم بیٹھ گیا اور دھپ ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔

"ہائیں! یہ فاروق ہوا میں کیسے تبدیل ہو گیا۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"اور بھابی کہاں ہیں۔" پروفیسر داؤد نے پوچھا۔

"آپ سب کے لیے ناشتا تیار کر رہی ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ظاہر ہے، آپ لوگ ناشتہ کر کے تو آئے نہیں ہوں گے۔"

"ناشتہ کیسے کرتے، اخبار ہمیشہ ناشتے سے پہلے دیکھتے ہیں اور تمہارے زخمی ہونے کی خبر پڑھنے کے بعد ناشتے کا ہوش کسے رہتا۔"

"اسی لیے میں نے بیگم کو پہلے ہی ناشتہ تیار کرنے کے لیے بھیج دیا تھا۔" انہوں نے کہا۔

"پھر تو مجھے بھی ان کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔" شہناز بیگم نے کہا اور کمرے سے نکل گئیں۔ اب سب لوگ بیٹھ گئے۔

ایک بار پھر گھنٹی بجی، فاروق گیا اور ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے کر اندر آیا۔ اس نے امجد رؤف کا معائنہ کیا اور آخر بولا:

"اچانک خوف نے انہیں بے ہوش کر دیا ہے۔ میں انجکشن دیے دیتا ہوں۔۔۔ آدھ گھنٹے تک ہوش میں آجائیں گے۔"

"بہت بہتر۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ پھر چونک کر کہا: "ڈاکٹر صاحب۔۔۔ ذرا اس نشان کو تو دیکھیے جو ان کی دائیں آنکھ کے نیچے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ نشان پہلے موجود نہیں تھا، اور دراصل یہ اسی نشان کو دیکھ کر بے ہوش ہوئے ہیں۔"

"کیا!!" ڈاکٹر کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا، باقی سب بھی حیرت زدہ رہ گئے۔

"اگر یہ نشان پہلے ان کے چہرے پر موجود نہیں تھا تو پھر یہ مصنوعی نشان ہوگا اور مصنوعی نشان چہرے سے ہٹایا جا سکتا

ہے، پھر اس میں خوفزدہ ہونے کی کون سی بات ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"سوال تو یہ ہے کہ ان کی بے خبری میں نشان ان کے چہرے پر کہاں سے آگیا، اور یہ اسے دیکھتے ہی بے ہوش کیوں ہو گئے۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا اس نشان سے کوئی تعلق ضرور ہے۔" خان رحمان نے کہا۔

"ہاں! تعلق تو ضرور ہے۔۔۔ ورنہ یہ بے ہوش کیوں ہوتے، خیر یہ تو ان کے ہوش میں آنے کے بعد ہی معلوم ہوگا!۔۔ فی الحال تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ نشان اصلی ہے یا نقلی۔ ڈاکٹر صاحب! ذرا آپ ہی جائزہ لیجیے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بہت اچھا۔" ڈاکٹر نے کہا اور اس نشان پر جھک پڑے۔ پہلے تو انہوں نے نشان کو انگلی سے چھو کر دیکھا، لیکن وہ ابھرا ہوا نہیں تھا۔ پھر نشان کے آس پاس کے حصے کو بھینچ کر دیکھا، تاکہ دوران خون رکنے پر نشان کو دیکھ سکیں۔ آخر چند منٹ بعد سیدھے ہوتے ہوئے بولے:

"مجھے حیرت ہے، یہ نشان سو فیصد اصلی ہے۔"

"کیا!!!" ان سب کے منہ سے نکلا۔

یہ ان کی زندگی کا عجیب ترین لمحہ تھا۔

ایک اور ملاقاتی

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر یہ پیدائشی نشان ہے تو آج تک امجد رؤف صاحب اس نشان سے بے خبر کیسے رہ سکتے تھے؟" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں، آپ سب آگے بڑھ کر اس نشان کا جائزہ لے سکتے ہیں؟" ڈاکٹر نے کہا۔ اس پر پروفیسر داؤد نے بھی اُٹھ کر نشان کو دیکھا اور پھر ان کے منہ سے بھی یہی نکلا:

"سو فیصد اصلی... اس میں ذرا بھی شک نہیں۔"

"پھر تو دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں، یا تو امجد رؤف نے اس نشان کے بارے میں جھوٹ بولا۔ یا پھر یہ ان کی جلد پر یکایک نمودار ہوا ہے، مجھے دوسرا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ امجد رؤف اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتے، ظاہر ہے، ہم ان کے گھر کے افراد سے معلوم کر سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔ پھر وہ پروفیسر داؤد کی طرف مڑے:

"آپ بتائیے! کیا کوئی ایسی صورت ہے کہ جلد پر کوئی نشان

اس طرح یکایک اُبھر آئے؟"

"میرے علم میں تو نہیں!" انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔

اسی وقت گھنٹی بجی، اس مرتبہ اکرام آیا تھا، انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی سے تمام حالات سنائے اور پھر کاغذ پر چند باتیں لکھ کر دے دیں۔ اس نے کاغذ کو پڑھا اور پھر سلام کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا... فاروق اسے رخصت کر کے واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔

"ابا جان! اخبار آ گیا ہے، آپ کو آج اخبار کا بہت انتظار تھا۔"

"اپنے زخمی ہونے کی خبر پڑھ کر خوش ہونے کا پروگرام بنا رہے ہوں گے۔" خان رحمان ہنسے۔

"یہ بات تو خیر نہیں تھی... لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج میں نے اخبار کا بہت بے چینی سے انتظار کیا ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا اور پھر فاروق کے ہاتھ سے اخبار لے کر دیکھا۔ ان کے زخمی ہونے کی خبر پہلے صفحے پر نچلے حصے میں موجود تھی۔ جب کہ انور کریم کے پراسرار طریقے پر قتل ہو جانے کی خبر دوسرے صفحے پر تھی۔ اخبار ہاتھ میں لینے سے پہلے انسپکٹر جمشید نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ضرور ڈال لی تھی۔

آدھ گھنٹے بعد امجد رؤف کو ہوش آیا۔ ان کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ تھر تھر کانپتی آواز میں بولے:

"کک... کیا وہ نشان اب بھی میرے چہرے پر موجود ہے؟"

"جی ہاں!" فاروق نے کہا "کیا آج سے پہلے یہ نشان آپ کو نظر نہیں آیا؟"

"نہیں! میں نے تو آج ہی دیکھا ہے، ویسے میں آئینہ بہت کم دیکھتا ہوں، پھر بھی گھر کا کوئی فرد تو مجھے اس نشان کے بارے میں بتا سکتا تھا۔" انھوں نے کہا۔

"شاید یہ اس صدی کا سب سے حیرت انگیز ترین واقعہ ہے۔ خیر آپ اس نشان کے بارے میں مجھے فون کرتے رہیے گا، مجھے ڈاکٹر نے کم ازکم ایک ہفتے تک بستر سے نہ ہلنے کی ہدایت کردی ہے اور اب میں ان لوگوں کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا۔"

"کوئی بات نہیں، خدا کرے، آپ جلد اچھے ہوجائیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے سب سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہوگئے۔

"ابا جان! ایک بات مجھے ابھی ابھی یاد آئی ہے۔ رات جب آپ زخمی حالت میں ہمیں ملے تھے تو ہم نے ڈاکٹر انصاری کو فون کیا تھا، لیکن ان کی بجائے آگئے نقلی ڈاکٹر.... آخر ڈاکٹر انصاری کیوں نہیں پہنچے تھے، ان کے بارے میں ہم نے معلوم ہی نہیں کیا۔" محمود نے کہا۔

"اوہ۔ فوراً انہیں فون کرکے معلوم کرو... کہ ان پر کیا گزری۔" انسپکٹر جمشید پریشان ہوکر بولے۔

"اچھی بات ہے۔" محمود نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ فاروق اور فرزانہ بھی ساتھ آ اٹھے۔ تینوں بیگم شیرازی کے گھر آ گئے... ڈاکٹر انصاری کے نمبر ملائے تو دوسری طرف سے ان کی آواز سنائی دی:

"بھئی آپ لوگ بھی عجیب ہیں، جب کل میں نہیں پہنچا تو میری خبر تو لی ہوتی، ظاہر ہے، میں نے فون پر کہا تھا کہ پہنچ رہا ہوں اور پہنچ نہ سکا تو آپ کو یہ سوچنا چاہیے تھا کہ کہیں مجھے کوئی حادثہ تو نہیں پیش آگیا۔" ان کا لہجہ شکایت بھرا تھا۔

"بات دراصل یہ ہے جناب کہ رات یہاں آپ کی بجائے نقلی ڈاکٹر آ گئے تھے، وہ ابا جان کو زہر کا انجکشن دینا چاہتے تھے، لیکن ہم نے عین وقت پر تاڑ لیا، ان سے جھڑپ ہوئی اور انہیں گرفتار کرلیا گیا، بس اسی ہنگامے میں رات بسر ہوئی۔ ابھی ابھی آپ کا خیال آیا ہے۔"

"چلو شکر ہے... خیال آیا تو، اب سنو... میں بکس لے کر گھر سے نکلا تو کسی نے میرے سر پر کوئی چیز دے ماری اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو اٹھ کر واپس گھر پہنچا اور سر پر پٹی باندھتے باندھتے پھر بے ہوش ہوگیا۔ پھر صبح ہی میری آنکھ کھلی۔"

"اوہ تو یہ بات تھی۔" محمود نے پرسکون آواز میں کہا۔

"ہاں! اور اب میں انسپکٹر صاحب کو دیکھنے کے لیے آرہا ہوں۔"

"ضرور آیئے۔" اس نے کہا۔

فون کر کے وہ گھر پہنچے تو گھر میں ایک اور ملاقاتی آیا بیٹھا تھا، لیکن اس شخص کو انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں پر عینک اور سر پر ہیٹ تھا۔ کوٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھا، قد چھوٹا اور جسم موٹا تھا۔ اسے دیکھ کر پہلا خیال انہیں یہ آیا کہ اگر اس شخص کو بھاگنا پڑ جائے تو ایک فرلانگ دوڑ کر ہی ہانپنے لگ جائے۔

وہ کمرے میں داخل ہوتے تو انسپکٹر جمشید بولے:

"آؤ بھئی! ان سے ملو... یہ پروفیسر رحمانی ہیں۔ انور کریم کے گہرے دوستوں میں سے ہیں، ان کے خوفناک طریقے پر قتل کی خبر پڑھ کر وہاں گئے تھے، انور کریم کی بیگم سے انہیں تمہارے بارے میں معلوم ہوا... کہ کس طرح کل تمہارے سامنے ان کے ہاتھ سے کوئی رومال چھین کر بھاگ گیا تھا اور یہ بھی کہ عین واردات کے چند لمحے بعد تم لوگ وہاں پہنچ گئے تھے... یہ تفصیل جاننے کے لیے آئے ہیں۔ انہیں اپنے دوست کی موت سے بہت صدمہ پہنچا ہے اور یہ چاہتے ہیں، کسی طرح قاتل گرفتار ہو جائے۔"

"ہم سب کی یہی خواہش ہے۔" فاروق نے آگے بڑھ کر کہا اور پھر انہوں نے پروفیسر رحمانی سے ہاتھ ملائے۔ انہیں تفصیل بتائی...

دوسرے لوگ رخصت ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد پروفیسر رحمانی بھی جانے کے لیے اٹھے، انہوں نے ان تینوں سے ہاتھ ملائے اور پھر انسپکٹر جمشید سے بھی ہاتھ ملایا۔ وہ انہیں رخصت کر کے آئے تو

انسپکٹر جمشید بولے:

"پروفیسر صاحب کے ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ ہاتھ ملاتے وقت ان کے ناخن سے میرے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ہلکی سی خراش آگئی ہے، اس میں جلن ہو رہی ہے۔ مجھے سپرٹ یا ڈیٹول دے دو۔ "سکول سے چند دن کی چھٹی لے لو..."

"جی بہتر!" تینوں نے ایک ساتھ کہا۔

وہ سپرٹ لگا کر فارغ ہوئے تھے کہ ڈاکٹر انصاری آ گئے، انہوں نے پٹی دیکھی اور پھر اسے کھول کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی، کیونکہ انسپکٹر جمشید کے چہرے پر اطمینان کے آثار تھے۔

"ڈاکٹر صاحب! ایک بات تو بتائیے، کیا کسی شخص کے چہرے پر یکا یک ایسا نشان بھی پیدا ہو سکتا ہے جو پیدائشی نظر آئے۔" اچانک انسپکٹر جمشید نے ان سے سوال کیا۔

"جی — کیا مطلب — میں سمجھا نہیں۔" ڈاکٹر صاحب حیران ہو کر بولے۔

"مطلب یہ کہ ایک سرکاری آفیسر امجد رؤف کے چہرے پر دائیں آنکھ کے نیچے آج سرخ رنگ کا تکونا سا نشان دیکھا گیا ہے، لیکن ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے چہرے پر یہ نشان پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"کیا... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" ڈاکٹر صاحب کے لہجے میں بلا

کی حیرت جھلک آئی۔

"امجد رؤف کا بیان غلط نہیں ہو سکتا، کیونکہ گھر کے افراد اور ملازمین سے پوچھ گچھ کی جا سکتی ہے اور اگر یہ نشان ان کے چہرے پر شروع سے رہا ہے تو پھر کوئی تو جھوٹ نہیں بول سکے گا۔"

"اُف خدا..... مجھے سوچنے کی مہلت دیجیے۔ مجھے کچھ یاد آ رہا ہے، میرا خیال ہے۔ یہ ممکن ہے۔"

"کیا کہا..... یہ ممکن ہے۔" انسپکٹر جمشید چلائے۔

"ہاں! مجھے ایسا یاد پڑتا ہے، میں اس بارے میں کہیں پڑھا ہے۔ کہاں پڑھا ہے، یہ یاد نہیں آ رہا۔" انہوں نے پریشان ہو کر کہا۔

"تو پھر خدا کے لیے یاد کرنے کی کوشش ضرور کیجیے۔"

"میں ابھی گھر جا کر دیکھتا..... شاید مجھے وہ کتاب مل جائے۔" انہوں نے اُٹھتے ہوئے کہا اور پھر جلدی جلدی ان سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

وہ حیران رہ گئے کہ ڈاکٹر انصاری کو اتنی جلدی کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔

○

"جہاں تک میرا خیال ہے، آج رات امجد رؤف خطرے میں ہیں۔" محمود نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ انسپکٹر جمشید

کی آنکھ لگ گئی تھی اور وہ وہاں سے اُٹھ آئے تھے۔

"ہاں! اگر سرخ نشان پیدا ہونے کا مطلب یہی ہے تو پھر ضرور ان کی زندگی خطرے میں ہے، لیکن ان کا کہنا ہے کہ ان کی کوٹھی بہت محفوظ ہے اور کوئی کتا اندر داخل نہیں ہو سکتا۔" فاروق بولا۔

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں..... کیوں نہ آج رات ہم امجد رؤف کی کوٹھی کے آس پاس رہیں۔" فرزانہ نے تجویز پیش کی۔

"اگر ابا جان نے اجازت دے دی تو ایسا ہی کریں گے۔" محمود بولا۔

"اس وقت تک ہم یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکے کہ یہ سب چکر کیا ہے، اس کے چہرے پر دائیں آنکھ کے نیچے سرخ نشان کیسے پیدا کر دیتا ہے۔" فاروق کہتا چلا گیا۔

"فاروق! یہ تم باتوں باتوں میں کیا کہہ گئے۔" فرزانہ بڑے زور سے چونکی۔

"کیوں! کیا میں نے بے وقوفی کی کوئی بات کہہ دی؟" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"نہیں! شاید تم نے زندگی میں پہلی مرتبہ کوئی عقل مندی کی بات کی ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"تمہارا مطلب ہے اس سے پہلے میں نے تمام باتیں بے عقلی کی

کی ہیں۔" فاروق نے بڑا سا منہ بنا کر کہا۔

"ارے ارے برا مت مانو۔ اس وقت واقعی تم ایک ایسی بات کہہ گئے ہو، جسے اس کیس میں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔"

"ذرا میں بھی تو سنوں، میں ایسی کیا بات کہہ گیا ہوں۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"تم نے کہا ہے کہ وہ شخص جسے بھی قتل کرنا چاہتا ہے پہلے اس کے چہرے پر دائیں آنکھ کے نیچے ایک سرخ رنگ کا تکونا نشان کسی طریقے سے پیدا کر دیتا ہے اور پھر کتے کے ذریعے اسے ہلاک کروا دیتا ہے۔"

"ہاں تو پھر، تم میری اس بات پر حیران کیوں ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی تک ہم میں سے کوئی اس نتیجے پر ہرگز نہیں پہنچے تھے کہ سرخ نشان اس شخص کے چہرے پر نمودار ہوتا ہے جسے وہ ہلاک کرنے کا پروگرام بناتا ہے۔ انور کریم کے چہرے پر پارک میں ہم نے ایسا ہی نشان دیکھا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس نشان نے ہی ہمیں اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔" محمود بولا۔

"پھر کیا خیال ہے، کیا اس خیال سے ابا جان کو آگاہ کریں۔" فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

"اس وقت تو وہ سو رہے ہیں، جب جاگیں گے تو یہ خیال ان پر ضرور ظاہر کریں گے اور اس کے ساتھ ہی میں امجد رؤف کے لیے

فکر مند ہو گیا ہوں۔" محمود نے کہا۔

"فکر نہ کرو، ہم ان کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔" فرزانہ بولی۔

باتیں کرتے انہیں ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پھر انہوں نے سوچا، ان کے والد جاگ گئے ہوں گے، چل کر ان سے بات کرنی چاہیے۔ وہ اٹھ کر باہر نکل آئے اور ان کے کمرے میں پہنچے۔ انسپکٹر جمشید جاگ گئے تھے، البتہ ابھی تک لیٹے ہوئے تھے۔ پھر جونہی ان کی نظر اپنے والد کے چہرے پر پڑی وہ بڑے زور سے اچھلے۔

ان کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئیں، کیونکہ ان کے چہرے پر دائیں آنکھ کے نیچے سرخ رنگ کا تکونا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔

کتا جھپٹتا ہے

"خیر تو ہے... تم مجھے دیکھ کر اس طرح اچھل کیوں پڑے؟" انسپکٹر جمشید نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"اُف خدا... یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟" فرزانہ کے منہ سے دہشت زدہ لہجے میں نکلا۔

"کیا دیکھ رہے ہو، کیا بات ہے بھئی... تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟"

"ابا جان آپ کے چہرے پر..." فاروق کہتا کہتا رُک گیا، اس کی ہمت جواب دے گئی۔

"میرے چہرے پر... اوہ... تو کیا تمہیں میرے چہرے پر سرخ تکونا نشان نظر آ رہا ہے؟" انہوں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"ج... جی ہاں!" فرزانہ ہکلائی۔

"اوہ! تو یہ بات ہے، خیر... تو اس میں اتنا گھبرانے اور فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے... میں تم تینوں کو اتنا بزدل نہیں سمجھتا تھا۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"ہم بزدل نہیں ہیں ابا جان... لیکن سوال تو یہ ہے کہ یہ نشان آپ کے چہرے پر کس طرح نمودار ہو گیا؟"

"جس طرح انور کریم اور امجد رؤف کے چہرے پر نمودار ہوا ہو گا۔" وہ مسکرائے۔

"ہم تو آج رات امجد رؤف کی کوٹھی کے آس پاس رہنے کا پروگرام بنا رہے تھے، لیکن..." محمود کہتے کہتے رُک گیا۔

"لیکن کیا، تمہیں اپنا پروگرام ختم نہیں کرنا چاہیے، نیک کام کا ارادہ کرنے کے بعد ارادہ بدل نہیں دینا چاہیے۔"

"لیکن آپ زخمی ہیں۔"

"آج رات میرے لیے کوئی خطرہ نہیں... البتہ امجد رؤف ضرور خطرے میں ہیں... کیونکہ ان کے چہرے پر نشان مجھ سے پہلے ہی نمودار ہو چکا ہے۔ ہو سکتا ہے، میری باری کل آئے۔ امجد رؤف جب کل میرے پاس آئے تھے تو شاید اس وقت بھی یہ سرخ نشان موجود تھا۔ لہذا آج رات خطرہ انہیں ہے اور سنو، میرے چہرے پر نشان نظر آنے سے ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"جی کیا مطلب... کون سا مسئلہ؟"

"یہ کہ ان وارداتوں کا ذمے دار کون ہے؟" انہوں نے کہا۔

"کیا مطلب... کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجرم کو پہچان گئے ہیں؟"

"نہیں، ابھی نہیں... لیکن اب پہچاننا کچھ مشکل نہیں رہا... کل سے

اس وقت تک مجھ سے جو آدمی مل چکے ہیں، مجرم ان میں سے ایک ہے۔ اس سے بڑی غلطی ہوئی جو میرے چہرے پر بھی نشان بنانے کا انتظام کر گیا، ظاہر ہے کوئی شخص میرے قریب آ کر ہی یہ نشان پیدا کر سکتا ہے۔ کیسے پیدا کر سکتا ہے، یہ ہم پروفیسر رحمانی سے معلوم کریں گے، لیکن اس سے پہلے ہم یہ جائزہ لیں گے کہ کل سے اس وقت تک مجھ سے کس کس آدمی نے ملاقات کی ہے۔ کل دفتر میں امجد رؤف نے ملاقات کی تھی، گھر میں اپنے آدمیوں کو چھوڑ کر کیوں کہ ان میں سے کوئی مجرم ہو ہی نہیں سکتا، امجد رؤف نے دوبارہ ملاقات کی، ڈاکٹر انصاری بھی آئے تھے۔ ان کے علاوہ وہ ڈاکٹر... جو رات کو میری مرہم پٹی کر گیا تھا۔ اور وہ نقلی ڈاکٹر اور اس کا ساتھی۔ رات والے ڈاکٹر کا کیا نام تھا؟" انہوں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر ارشاد کریمی۔" فاروق نے کہا۔

"اب اگر دونوں نقلی ڈاکٹروں میں سے یہ کام کسی کا نہیں تو پھر صرف امجد رؤف، ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر ارشاد کریمی نے مجھ سے ملاقات کی ہے۔"

"ابا جان! آپ ایک نام بھول رہے ہیں۔" فرزانہ نے چونک کر کہا۔

"اور وہ کون سا؟" انہوں نے پوچھا۔

"پروفیسر رحمانی!" اس نے کہا۔

"اوہ!" تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا، وہ حیران رہ گئے۔

"واقعی... یہ شخص بلا ضرورت ہی مجھ سے ملنے آیا تھا، اسے کوئی خاص کام نہیں تھا، ہمیں فوراً اس کی نگرانی کا بندوبست کرنا چاہیے۔" انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی کہا۔

"اور ابا جان۔" محمود نے کچھ سوچ کر کہا: "رخصت ہوتے ہوئے اس نے جب آپ سے ہاتھ ملایا تھا تو اس کے ناخن سے آپ کے ہاتھ پر خراش بھی تو آئی تھی۔" اچانک فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"اوہ!!!"

وہ دھک سے رہ گئے۔ آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

"تت... تو کیا... پروفیسر رحمانی مجرم ہے۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"ان حالات میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن اس کا ان وارداتوں سے مقصد کیا ہے؟"

"یہی تو ہمیں معلوم کرنا ہے... یہ بات معلوم ہوتے ہی پورا کیس حل سمجھو۔" انہوں نے کہا۔

"سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں؟"

"تم آج رات امجد رؤف کے گھر کے آس پاس رہو، چھوٹے پستول ساتھ لے جانا، اگر کتا ان کی کوٹھی پر حملہ آور ہو تو بے دھڑک فائر کر کے اسے ختم کر دینا، تاہم میں سمجھتا ہوں، تم اسے ختم نہیں کر سکو گے۔"

"جی کیا مطلب... کیا کتے کو بلٹ پروف پہنا دیے گئے ہیں"
"نہیں... ایسی کوئی بات نہیں... خیر دیکھا جائے گا"
"اور اگر کتا اُدھر کی بجائے ادھر آ گیا" فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔
"تم میرا فکر نہ کرو، میں اپنے سرہانے پستول رکھ لوں گا اور تمام رات سوؤں گا نہیں... میں یہ بھی جانتا ہوں کتا کس راستے کمرے میں داخل ہو گا، لہٰذا میں اس سے نبٹ لوں گا"
"وہ کس راستے داخل ہو گا؟" محمود نے حیران ہو کر کہا۔
"روشن دان کے راستے!" انہوں نے مسکرا کر کہا۔
"او، لیکن ابا جان... یہ کیسے ہو سکتا ہے" فاروق نے اچانک کہا۔
"کیا کیسے ہو سکتا ہے؟"
"انور کریم کا تو رومال اڑا لیا گیا تھا... اور اس رومال کو سونگھا کر ہی کتے کو بھیجا گیا تھا، لیکن آپ کی طرف وہ کیسے آ سکتا ہے؟" فاروق نے کہا۔
"اچھا سوال ہے... اور میں کافی دیر سے سوچ رہا تھا کہ تم میں سے کوئی یہ سوال کرتا ہے یا نہیں۔ آخر فاروق کو اس کا خیال آ ہی گیا" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔
"جی! کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ آج کسی وقت یہ کام بھی کیا جا چکا ہے، تپائی

پر میرا رومال پڑا تھا، جب مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی اور میں نے اسے اٹھانا چاہا تو وہ وہاں موجود نہیں تھا" یہ کہتے وقت ان کے چہرے پر ایک خوش گوار مسکراہٹ تھی۔
"کیا!!" تینوں اتنے زور سے چلائے کہ بیگم جمشید گھبرا کر باورچی خانے سے نکل آئیں اور ان کے کمرے میں داخل ہو گئیں، لیکن پھر انسپکٹر جمشید کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر سمجھ گئیں کہ کوئی حیرت انگیز بات ہوئی ہو گی جس پر تینوں چلا اٹھے۔
"توبہ ہے... اتنے زور سے تو نہ چیخا کرو" انہوں نے منہ بنا کر کہا۔
"جی اچھا... اب کم زور سے چیخا کریں گے"
"بیگم اچھا ہوا تم آ گئیں۔ میری الماری میں سے پستول نکال کر اسے ذرا صاف کر دو اور گولیاں بھر دو"
"کیوں؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔
"شاید تمہاری نظر ابھی تک میرے چہرے پر نمودار ہونے والے نشان پر نہیں پڑی"
"کیا!!" وہ اتنے زور سے چلائیں کہ محمود، فاروق اور فرزانہ کو بھی مات کر گئیں۔
"امی جان! اب آپ کیوں اتنے زور سے چلائیں" فاروق رہ نہ سکا۔

"تو کیا تم بھی اسی بات پر چلائے تھے؟"

"ہم جس بات پر چلائے تھے، وہ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ کو انور کریم کے متعلق تو سب کچھ معلوم ہے کہ پہلے ان کا رومال چرایا گیا اور پھر کس طرح ایک کتے کے ذریعے انہیں ختم کرایا گیا۔"

"ہاں ہاں! مجھے سب کچھ معلوم ہے تو پھر؟"

"پھر یہ کہ ابا جان کا بھی رومال غائب ہے۔" محمود نے کہا۔

"کیا!!!" ایک بار پھر وہ اتنے ہی زور سے چلا اٹھیں۔

ان کی آنکھوں میں خوف کا سمندر سمٹ آیا۔

○

رات تاریک تھی۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں، تاہم سڑکوں پر جلنے والے بلب سڑک پر مدھم روشنی پھیلا رہے تھے۔ ایسے میں تین سائے ایک سڑک پر بڑھ رہے تھے۔

"انور کریم کے کمرے کا ہم نے اچھی طرح جائزہ لیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ انہوں نے کتے پر چھ فائر کیے تھے، کیونکہ چھ جگہ سے کمرے کا پلاسٹر ادھڑا پڑا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا انور کریم کا نشانہ اتنا ہی کمزور تھا؟"

"یا تو ان کا نشانہ کمزور تھا یا پھر کتا ہی بہت پھرتیلا تھا۔" فرزانہ بولی۔

"ابا جان کے بیان کی روشنی میں تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ کتا بہت پھرتیلا ہے۔" فاروق نے کہا۔

"کون سے بیان کی روشنی میں!" محمود بولا۔

"یہی کہ ان کے خیال میں ہم کتے کو ختم نہیں کر سکیں گے... ذرا سوچو، ہم تینوں کے پاس پستول موجود ہیں، ہم ایک ساتھ اس پر فائر کریں اور اس کے باوجود ابا جان یہ خیال ظاہر کریں کہ ہم اسے ختم نہیں کر سکیں گے... تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ کتا بہت پھرتیلا ہے۔" فاروق کہتا چلا گیا۔

"تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ بے چارے انور کریم کا کوئی قصور نہیں تھا۔" محمود بولا۔

"اگر ہم کتے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو پھر ابا جان نے ہمیں یہاں آنے ہی کیوں دیا؟" فرزانہ نے سوال کیا۔

"اس میں بھی کوئی فارمولا نظر آیا ہوگا انہیں۔" فاروق بولا۔

تینوں باتیں کرتے ہوئے امجد رؤف کی کوٹھی کے قریب پہنچ گئے، انہوں نے دیکھا، کوٹھی کی چہار دیواری واقعی بہت اونچی تھی اور اس کے اوپر باڑھ بھی لگی تھی۔ دروازہ بہت مضبوط اور اندر سے بند تھا۔

"یہاں کتے کی دال نہیں گلے گی۔" محمود نے کہا۔

"ظاہر ہے، کتا اتنی اونچی چھلانگ نہیں لگا سکتا۔" فاروق نے کہا۔

"کتے کا مالک اگر اسے ادھر بھیجے گا تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی بھیجے گا۔" فرزانہ نے کہا۔

"امجد رؤف کا بیان ہے کہ دو تین دن سے دروازے پر کھڑکھڑاہٹ ہوتی ہے جیسے کوئی دروازے پر زور آزمائی کرتا ہو۔"

"اب آگئے ہیں تو پھر کچھ دیکھ کر ہی جائیں گے۔" فرزانہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اچانک ایک کار کی لائٹیں انہیں بہت دور سے اپنی طرف آتی نظر آئیں۔ وہ ایک طرف دبک گئے۔ اب کار میں موجود شخص انہیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آدھ منٹ بھی نہ گزرا ہو گا کہ کار ان سے کچھ فاصلے پر آکر رک گئی۔ انہوں نے اپنے سانس روک لیے۔ دل دھک دھک کرنے لگے۔ پھر کار کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک سیاہ کپڑوں والا آدمی نکلا۔ اس کے بعد اس نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا... اور چٹکی بجائی ایک کتا ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ باہر نکلا۔ اس کے گلے میں ایک چمڑے کا پٹا تھا اور پٹے سے ایک زنجیر بندھی تھی... کار والے نے زنجیر پٹے سے الگ کر دی اور پھر اپنی جیب سے ایک کپڑے کا ٹکڑا سا نکال کر کتے کے آگے ڈال دیا۔ کتا چند منٹ تک اسے سونگھتا رہا۔ پھر انہوں نے ایک

سرگوشی سنی:

"گو.... ٹائیگر گو۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے کوٹھی کی طرف اشارہ کیا، کتا تیر کی طرح اس طرف چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سیاہ پوش کار میں بیٹھا، اسے بیک کیا اور کار پوری رفتار سے دوڑتی ان کی نظروں سے دور ہونے لگی۔ اب وہ اس کونے سے نکلے اور کوٹھی کی طرف لپکے۔ قریب پہنچ کر انہوں نے دیکھا، کتے نے ایک بہت اونچی چھلانگ لگائی، مگر تاروں کی باڑھ سے ٹکرا کر نیچے آرہا۔ اس کے حلق سے ایک خوفناک غراہٹ اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک چھلانگ اور لگائی۔ اس مرتبہ وہ باڑھ کے اوپر والے سرے سے ٹکرایا اور پھر نیچے آرہا:

"محمود... خدا کے لیے اس پر فائر کرو، اگر اس نے ایک چھلانگ اور لگالی تو یہ دوسری طرف پہنچ جائے گا اور پھر اس سے امجد رؤف کو کوئی نہیں بچا سکے گا۔" فرزانہ نے تیز اور سرد آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا پستول نکال لیا۔ محمود اور فاروق نے بھی دیر نہ لگائی۔ ادھر کتا تیسری چھلانگ کی تیاری کر رہا تھا، تینوں نے ایک ساتھ فائر کیے، فائروں کی آواز کے ساتھ ہی کتے نے ایک ہی چھلانگ لگائی اور انہوں نے صاف طور پر محسوس کر لیا کہ ان کے فائر حویلی کی دیوار کا پلستر اکھاڑ سکے تھے اور کتا ان

کی نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔

"ارے وہ اندر کود گیا ہے۔" فرزانہ چلائی۔

"دروازے کی طرف دوڑو۔" محمود نے چیخ کر کہا۔

تینوں دوڑتے ہوئے کوٹھی کے دروازے پر آئے اور محمود نے گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ اسے دباتا ہی چلا گیا۔

خونی منظر

دروازہ کھلنے سے پہلے ایک خوفناک اور لرزا دینے والی چیخ ان کے کانوں سے ٹکرائی اور وہ کانپ اٹھے۔ وہ سمجھ گئے کہ کل والا منظر پھر دیکھنے کو ملے گا۔ دروازہ کھولنے والا بھی دھک سے رہ گیا کہ یہ اندر کیا ہوا۔ وہ ایک نوجوان آدمی تھا۔

"اف خدا یہ کس کی چیخ تھی۔"

"امجد رؤف صاحب کی۔" محمود کے منہ سے نکلا۔ "جلدی کیجیے۔ ان کے کمرے کی طرف ہماری رہنمائی کیجیے۔ ان کی زندگی خطرے میں ہے۔"

"کیا مطلب... آپ کون ہیں؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔" محمود نے کہا اور دوڑتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

وہ تینوں بھی اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔

"امجد رؤف صاحب کا کمرہ کس طرف ہے۔" محمود نے بھاگتے بھاگتے پوچھا... کیونکہ دروازہ کھولنے والا نوجوان ان سے پیچھے

رہ گیا تھا۔

"اس طرف!" اس نے ایک برآمدے کی طرف اشارہ کیا۔

اور جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو وہ ادھڑے ہوئے گلے والی لاش کے سوا رکھا ہی کیا تھا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کی زندگی کا یہ ناکام ترین واقعہ تھا... وہ اس واردات سے پہلے یہاں پہنچ گئے تھے اور اس کے باوجود امجد رؤف کو نہ بچا سکے۔ نوجوان نے جو یہ ہولناک منظر دیکھا تو پاگلوں کی طرح چیخنے لگا، تھوڑی دیر میں ہی گھر کے باقی افراد بھی جمع ہو گئے، معلوم ہوا، دروازہ کھولنے والا امجد رؤف کا بھتیجا تھا۔ پھر پولیس کو فون کیا گیا۔ انہوں نے گھر کے افراد کو اپنے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ کس طرح امجد رؤف ان کے والد کے پاس آئے تھے اور یہ کہ ان کے دشمنوں نے انہیں بھی زخمی کر دیا ہے۔

غرض وہاں سے وہ پولیس کے آنے کے بعد ہی فارغ ہوئے تھے اور جب کوٹھی سے نکل کر اس جگہ پہنچے جہاں کار رکی تھی تو انہیں وہاں بھی ایک رومال ملا۔

"یار فاروق چوک ہو گئی۔" محمود نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"ہم کار کا نمبر نوٹ نہیں کر سکے، اور ابا جان ہم سے یہ ضرور پوچھیں گے کہ اس کار کا نمبر کیا تھا۔" محمود نے کہا۔

"اوہ! واقعی... بڑی بھول ہوئی۔" فاروق کے منہ سے نکلا، پھر دونوں نے فرزانہ کی طرف دیکھا، کیونکہ اس نے اس معاملے میں کچھ نہیں کہا تھا۔

"کیوں فرزانہ! تم کیوں خاموش ہو۔"

"مجھے یہ خیال ستا رہا ہے کہ ہمارے ہوتے ہوئے بے چارے امجد رؤف جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔"

"اور یہ خیال تمہیں کچھ نہیں کہہ رہا کہ ابا جان کار کا نمبر پوچھیں گے تو ہم کیا جواب دیں گے۔"

"یہ خیال تمہارے لیے تکلیف دہ ہو سکتا ہے، میرے لیے نہیں؟" اس نے مسکرا کر کہا۔

"وہ کیوں... کیا ابا جان تم سے نہیں پوچھیں گے۔" محمود نے منہ بنایا۔

"پوچھیں گے تو بتا دوں گی۔" وہ پھر شوخ انداز میں مسکرائی۔

"کیا بتا دو گی؟" فاروق نے اسے گھورا۔

"کار کا نمبر۔" اور کیا بتاؤں گی۔"

"ارے! تو کیا تم نے دیکھ لیا تھا۔!" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں! میں تمہاری طرح بدھو نہیں ہوں۔"

"بہت خوب! پھر تو مزا آ گیا۔" فاروق نے ہنس کر کہا۔

"کام میں نے دکھایا... اور مزا تمہیں آ رہا ہے... یہ اچھی رہی۔"

"چلو تم نے ہی سہی، ہمیں اس سے غرض نہیں... کار کا نمبر اب ہمیں معلوم ہے، ابا جان ہمیں ڈانٹنے سے تو بچ جائیں گے۔" فاروق نے خوشی سے بھرپور آواز میں کہا۔ اس کے جملے پر محمود اور فرزانہ بے ساختہ مسکرا دیے۔

باتیں کرتے کرتے وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں سیاہ پوش نے کار کھڑی کی تھی۔ اس جگہ ایک رومال ابھی تک پڑا تھا۔ انہوں نے یہ رومال بھی اٹھا لیا اور گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ انسپکٹر جمشید انہیں سوتے ہوئے ملے۔ دروازہ ان کی والدہ نے کھولا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی غیر حاضری میں سب خیریت رہی۔ اپنے والد کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ انہوں نے ان کی دائیں آنکھ کے نیچے دیکھا... سرخ نشان بدستور موجود تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ کل سیاہ پوش کتے کو لے کر ان کے گھر کے پاس آنے والا تھا۔

○

دوسری صبح انہوں نے اپنے والد کو پوری تفصیل سنا دی۔ ان کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی اور درد میں کمی تھی۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم اس کتے کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔" وہ مسکرائے۔

"اور ابا جان! آج وہ کتا ہمارے گھر کا رخ کرنے والا ہے۔"

"تو کیا ہوا، فکر نہ کرو۔" انہوں نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ فکر نہ کریں... رات ہم تینوں نے اس کتے پر ایک ساتھ فائر کیے تھے، لیکن اس کی ایک ہی چھلانگ نے ہم تینوں کے فائر بے کار کر دیے تھے..."

"پھر... تم نے کیا سوچا ہے، تم کیا کرو گے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہم بیٹھ کر سوچیں گے اور پھر آپ کو اپنا پروگرام بتا دیں گے۔" محمود نے کہا۔

اسی وقت گھنٹی بجی۔ پروفیسر داؤد اور شائستہ آئے تھے۔ وہ انسپکٹر جمشید کی خیریت معلوم کرنے آئے تھے، لیکن جب انہوں نے ان کے چہرے پر وہ سرخ رنگ کا نشان دیکھا۔ ان کا رنگ اڑ گیا۔ وہ دھک سے رہ گئے۔ ابھی وہ بت بنے بیٹھے ہی تھے کہ گھنٹی ایک بار پھر بجی اور اس مرتبہ خان رحمان اور ان کے بچے اندر آئے۔ انہوں نے پروفیسر داؤد کو بت بنے دیکھا تو بہت حیران ہوئے۔

"یار جمشید کیا تم نے پروفیسر داؤد پر جادو کر دیا ہے؟"

"ہاں! اور اس جادو کی لپیٹ میں ابھی تم بھی آ جاؤ گے۔" انہوں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے سرخ نشان کو دیکھ لیا۔ ان کے منہ سے خوفزدہ انداز میں نکلا۔

"ارے باپ رے... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔"

"وہی جو پروفیسر داؤد دیکھ کر بت بنے بیٹھے ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"یار جمشید! کیا تم مذاق کے موڈ میں ہو۔" آخر خان رحمان نے کہا۔

"آج یکم اپریل نہیں ہے اور ہوتی بھی تو بھی میں مذاق نہ کرتا۔" انھوں نے کہا۔

"تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے.. آخر یہ نشان تمہارے چہرے پر کس طرح آ گیا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"جس طرح امجد رؤف کے چہرے پر آ گیا تھا... آج وہ بیچارہ اس دنیا میں نہیں رہا۔"

"کیا مطلب... کیا اسے بھی ختم کر دیا گیا۔" خان رحمان چلائے۔

"ہاں! کتے نے اس کا گلا بھی ادھیڑ کر رکھ دیا، کیا آپ لوگوں نے ابھی تک اخبار نہیں دیکھا؟"

"نہیں، صبح اٹھتے ہی منہ دھو کر یہاں چلے آئے، سوچا تھا اخبار یہیں دیکھ لیں گے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"اور ناشتا بھی یہیں کر لیں گے۔" خان رحمان نے کہا۔

"ضرور... ناشتا تو میرا خیال ہے تیار ہو چکا ہے۔" انھوں نے بیگم کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں! بالکل تیار ہے۔"

"لیکن پہلے اس نشان کے بارے میں تو سوچ لو... کرنا کیا ہے۔" خان رحمان کا لہجہ پریشان تھا۔

"مجھے سوچنے کی کیا ضرورت ہے... محمود، فاروق اور فرزانہ سوچ تو رہے ہیں۔" وہ مسکرائے۔

"کیا مطلب! یہ کیا سوچ رہے ہیں۔" شہناز بیگم کے منہ سے نکلا۔

"یہی کہ مجھے اس کتے سے کیسے بچائیں۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"آخر یہ کتا ہے کیا بلا؟" پروفیسر داؤد نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"بہت خوفناک بلا ہے، اس کی کارگزاری یہ تینوں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، بہتر ہے، انہی سے پوچھ لو۔"

تینوں نے انہیں کتے کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پروفیسر داؤد نے تقریباً چلا کر کہا:

"اور ان حالات میں بھی تم بستر پر لیٹے مسکرا رہے ہو!"

"تو اور کیا کروں۔"

"سارے شہر کی پولیس کو چاہیے کہ اس پورے محلے کے گرد پھیل جائے اور اس کتے کو گولی مار دی جائے، کار والے سیاہ پوش کو گرفتار کر لیا جائے۔" انھوں نے کہا۔

"اس طرح کچھ نہیں ہوگا، وہ لوگ کتے کو گولی نہیں مار سکیں گے، گولی سے بچنا اس کے لیے معمولی بات ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں۔"

محمود، فاروق اور فرزانہ کا نشانہ کتنا اچھا ہے، تینوں نے ایک ساتھ اس پر فائر کیے تھے، لیکن بنا کچھ بھی نہیں۔"

"پھر کیا ہو گا؟"

"آپ لوگ فکر نہ کریں، میں اسے دیکھ لوں گا۔"

"بھئی کم از کم اپنے آفیسروں کو تو اطلاع کر دو۔"

"ہاں! میں ایسا ضرور کروں گا۔" انہوں نے کہا اور پھر محمود کی طرف مڑے۔

"اکرام کو فون کر دو۔۔۔ اسے میں نے کل کچھ کام سونپے تھے، ان کی رپورٹ بھی لینی ہے اور آج کے لیے ہدایات بھی دینی ہیں۔"

"جی اچھا۔" محمود نے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔

"دیکھو۔۔۔ جمشید۔۔۔ اگر تم زخمی نہ ہوتے تو ہم تمہیں تمہاری مرضی پر چھوڑ دیتے، لیکن ان حالات میں آخر تم اس خونخوار کتے کا مقابلہ کس طرح کرو گے؟"

"بستر پر لیٹے لیٹے۔۔۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کتا کس راستے سے آئے گا۔ جونہی اس کا سر مجھے نظر آئے گا، میرے پستول کی ایک گولی اس کے بھیجے میں اتر جائے گی۔" انہوں نے کہا۔

"وہ کس راستے سے آئے گا؟" پروفیسر داؤد نے پوچھا۔

"روشن دان کے راستے کمرے میں کودنے کی کوشش کرے گا، کیونکہ دروازے اور کھڑکیاں تو بند ہوں گی۔"

"ہوں!" پروفیسر داؤد کے منہ سے نکلا اور کچھ دیر کے لیے خاموشی

چھا گئی۔ پھر محمود اندر داخل ہوا۔

"بھئی ایک جگہ فون کرنا تو ہم بھول ہی گئے۔" انسپکٹر جمشید کو اچانک یاد آیا۔

"وہ کسے؟" فرزانہ اور فاروق کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ڈاکٹر انصاری کو۔ ہمیں ان سے معلوم کرنا ہے کہ کیا انہیں کچھ یاد آیا ہے؟" انہوں نے کہا۔

"جی اچھا! ہم ابھی جا کر انہیں فون کرتے ہیں۔" محمود نے کہا اور اس کے ساتھ فاروق اور فرزانہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یہ ڈاکٹر انصاری کا کیا معاملہ ہے؟"

"میں نے ان سے اس نشان کے بارے میں پوچھا تھا، وہ سوچ میں پڑ گئے، پھر کہنے لگے کہ انہیں کچھ یاد آ رہا ہے کسی جگہ انہوں نے اس طرح نشان پیدا ہونے کے بارے میں پڑھا تھا۔" انہوں نے بتایا۔

"اوہ!" پروفیسر داؤد کے منہ سے نکلا۔

"کیوں! آپ کیوں چونکے؟" خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

"اگر اس نے یہ چیز کسی کتاب میں پڑھی ہے تو پھر وہ کتاب میری لائبریری میں ضرور ہو گی اور اگر ڈاکٹر انصاری کو یاد نہ آیا تو میں ان کتابوں کو جا کر ضرور کھنگالوں گا۔" انہوں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ فون کر کے واپس آئے تو ان کے چہروں

پر مایوسی تھی۔

"شاید ڈاکٹر انصاری کو کچھ یاد نہیں آیا۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں! انہوں نے بہت افسوس کا اظہار کیا ہے۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ اب یہ کام میں کروں گا، میں اسی وقت واپس جا رہا ہوں اور لائبریری میں گھستا ہوں۔"

"لیکن... آپ پہلے ناشتا تو کر لیں۔"

"ناشتے کی ایسی کی تیسی۔" پروفیسر جھلا کر بولے۔

"کیوں انکل! ناشتے نے کیا قصور کیا ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"ناشتا ہمارا وقت ضائع کر سکتا ہے۔" انہوں نے بھی مسکرا کر کہا۔

"لیکن میں آپ کو ناشتے کے بغیر ہرگز نہیں جانے دوں گا۔" انہوں نے پُرزور لہجے میں کہا۔

"اچھا خیر... لیکن ذرا جلدی کرو، کیا خیال ہے، ناشتا اسی کمرے میں نہ کر لیا جائے۔" انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔

ناشتے کے فوراً بعد پروفیسر داؤد تو چلے گئے، البتہ شائستہ کو وہیں چھوڑ گئے، کیونکہ ابھی انہیں پھر واپس آنا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اکرام آگیا... اس نے انور کریم کی لاش کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں، پنش کس اور دوسری رپورٹیں بھی۔ اکرام بھی اس نشان کو

دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔

"آج کے اخبار میں تو اس نشان کے بارے میں ہی خبریں بھری پڑی ہیں... امجد رؤف کے قتل کی خبر بڑے ہولناک انداز میں شائع کی گئی ہے اور پولیس کو بہت سخت سست کہا گیا ہے۔"

"یعنی اب اس نشان کی حقیقت سے باخبر ہو چکے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"جی ہاں!"

"خیر! اب تمہیں دو تین کام کرنے ہیں، ایک کار کے نمبر محمود تمہیں نوٹ کرا دے گا، فوری طور پر یہ معلوم کرنا ہے کہ اس کا مالک کون ہے... آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب کو یہ اطلاع دینی ہے کہ میرے چہرے پر بھی نشان نمودار ہو گیا ہے اور آج رات میں اس کتے کا انتظار کروں گا... پروفیسر رحمانی کے بارے میں جس قدر معلومات بھی مل سکیں، حاصل کرنی ہیں، وہ امجد رؤف کا دوست تھا اور کل مجھ سے ملنے آیا تھا۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

"بہت بہتر! کیا میں چلوں۔"

"ہاں! لیکن جلد لوٹنا... کار کے مالک کا نام مجھے فوراً چاہیے۔" انہوں نے کہا۔

"جی اچھا!" اکرام یہ کہہ کر محمود کی طرف مڑا۔ فرزانہ نے کار کے

نمبر اسے بتا دیے تھے اور اس نے ان نمبروں کو اپنی ننھی سی نوٹ بک میں رکھ لیا تھا۔ نوٹ بک کھول کر اس نے نمبر اکرام کو بتائے اور وہ چلا گیا۔ آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب ان سے ملنے آ پہنچے۔ بہت فکر مند لگ رہے تھے.....

"اف جمشید! اب کیا ہو گا؟" آئی جی صاحب کے منہ سے نکلا۔

"آپ کیوں فکر کرتے ہیں شیخ صاحب؟" وہ مسکرائے۔

"حفاظت کے انتظامات کیا کیے ہیں؟" ڈی آئی جی صاحب نے پوچھا۔

"جی! ابھی تو کچھ نہیں کیا، کر لیں گے، ابھی تو رات بہت دور پڑی ہے۔"

"مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔ آخر یہ ہو کیا رہا ہے، وہ کون ہے، کیا چاہتا ہے؟" آئی جی صاحب بولے۔

"ابھی تک اگر کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی تو یہ دو باتیں..... ہم یہ جانتے ہیں، وہ کون ہے، نہ یہ کہ وہ چاہتا کیا ہے؟"

"پھر اسے گرفتار کیسے کیا جائے گا، ظاہر ہے، وہ تو اپنے کتے کو بھیج دیتا ہے۔"

"لیکن آج ہم اس کی رہائش سے ضرور واقف ہو جائیں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"وہ کیسے..... ذرا ہم بھی تو سنیں۔"

"وہ کتے کو لے کر جائے واردات کے نزدیک ایک کار میں آتا ہے، فرزانہ نے اس کار کے نمبر معلوم کر لیے ہیں، دوسرے یہ کہ آج اس کار کا تعاقب بھی کیا جائے گا۔"

"بہت خوب! چلو یہ تو ہوا، لیکن کتے کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟"

"اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا، آپ بے فکر رہیں۔" انہوں نے کہا۔

"بے فکر کیسے رہیں۔ شہر میں دو ہولناک وارداتیں ہو چکی ہیں... جب ان کی تفصیلات پر ذہن جاتا ہے تو فکر میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔"

"آپ یہ مجھ پر چھوڑ دیں..... میرے گھر کے گرد کسی حفاظتی انتظام کی ضرورت بھی نہیں، البتہ یہاں سے نکلنے والی ہر سڑک پر ایک تیز رفتار جیپ موجود ہونی چاہیئے، ان میں ڈرائیور بیٹھے ہوں اور انجن چل رہے ہوں..... انہیں ایک کالے رنگ کی کار کا تعاقب کرنا ہے اور ہر سڑک کے موڑ پر پہلے ہی ایک جیپ تیار رہنا چاہیے اور پولیس کے ذریعے اس کار کی ایک ایک منٹ کی پوزیشن بتائی جائے گی، اگر وہ شخص کسی کوٹھی یا مکان میں داخل ہو جائے تو اسے کچھ نہیں کہنا ہے، کوٹھی کی نگرانی بدستور جاری رہے گی اور مجھے اطلاع دے دی

جائے گی:

"ٹھیک ہے۔ یہ ہو جائے گا۔" ڈی آئی جی صاحب بولے۔

"نقلی ڈاکٹر راتھر اور اس کے ساتھی کو گرفتار کر لیا گیا تھا، ابھی تک ان سے کوئی بات معلوم نہیں کی جا سکی کہ انہیں کس نے بھیجا تھا۔"

"معلوم کرنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے، لیکن وہ دونوں بہت سخت جان ہیں،... ابھی تک انہوں نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔" ڈی آئی جی صاحب نے بتایا۔

"خیر... کوشش جاری رکھنی چاہیے۔" انہوں نے کہا۔

"میں ایک بار پھر یہ سوال کرتا ہوں، آخر تم نے کتے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"دراصل بات یہ ہے کہ کتے کے بارے میں سوچنے کا کام میں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کے ذمے لگا دیا ہے۔"

"کیا مطلب!" دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

وہ آگیا ہے

محمود، فاروق اور فرزانہ صبح سے ہی رات کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ وہ کیا کرنا چاہتے تھے، انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ البتہ انہوں نے تینوں کو کھلی چھٹی دے دی تھی... سب کچھ ان کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا اور ان سے کہہ دیا تھا:

"میں اس وقت تک کچھ نہیں کروں گا جب تک کتا مجھ سے نہ پہنچ جائے۔"

تینوں ناشتے کے بعد بازار گئے، وہاں انہوں نے بہت سی چیزیں خریدیں اور پھر ان چیزوں سے لدے پھندے واپس آئے۔ بیگم جمشید نے ان چیزوں کو دیکھ کر حیرت سے پلکیں جھپکائیں... لیکن منہ سے کچھ نہ بولیں، وہ جانتی تھیں، تینوں کسی چکر میں ہیں۔ اسی طرح سارا دن گزر گیا۔ شام کے وقت پروفیسر داؤد آئے اور وہ سب ان کے گرد جمع ہو گئے۔ خود وہ انسپکٹر جمشید کے پاس بیٹھ گئے۔

"جمشید! مجھے وہ کتاب مل گئی... یہ کتاب دنیا بھر کی جڑی

بوٹیوں پر ہے..... اس میں ایک ایسی جڑی بوٹی کا بھی ذکر ہے جو کانٹوں دار ہوتی ہے، اس کے ہر پتے پر پانچ کانٹے ہوتے ہیں۔ ایک روز ان میں سے ایک کانٹا کسی آدمی کے چبھ گیا تھا۔ اس سے اگلے دن اس کی دائیں آنکھ کے نیچے سرخ رنگ کا تکونا نشان بن گیا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے کئی ڈاکٹروں کو دکھایا مگر کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اتفاق سے اسے یہ بات یاد آئی کہ اس کے ایک کانٹا چبھ گیا تھا۔ وہ دوبارہ اس پودے کے پاس گیا اور ایک کانٹا توڑ لایا۔ اس نے کانٹا اپنے ایک دوست کی ہتھیلی میں چبھو دیا۔ دوست اسے شرارت سمجھا اور کوئی خیال نہ کیا، دوسرے دن جب اس آدمی نے اپنے دوست کے چہرے کا جائزہ لیا تو وہاں بھی ویسا ہی نشان بن چکا تھا..... اب وہ ایک سائنس دان کے پاس گیا، اس نے ساری بات اسے بتائی، اس طرح اس پودے پر تجربات ہوئے..... اور اس کا ذکر کتابوں اور رسالوں میں آ گیا..... یہ پودا دراصل زہریلا ہے اور اس کا زہر دائیں آنکھ کے نیچے جلد میں تکونی شکل کی صورت میں آ جاتا ہے..... اور چند دن بعد خود بخود غائب ہو جاتا ہے..... اب اگر میں یہ بھی بتا دوں کہ یہ کس ملک میں پایا جاتا ہے تو شاید تم لوگ چونک اٹھو گے۔"

"انکل ضرور بتا دیں، ہم چونکنے کے لیے تیار ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

جواب میں پروفیسر نے جس ملک کا نام بتایا، وہ ان کے لیے نہ

صرف چونکا دینے والا تھا، بلکہ سنسنی خیز بھی تھا۔ نام ان کے بدترین دشمن ملک کا تھا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے، دشمن ملک کے کسی گروپ نے اس زہر کو اپنا نشان بنا لیا ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"اگر آپ کا خیال درست ہے تو آپ انور کریم اور امجد رؤف کو کس خانے میں فٹ کریں گے..... آخر یہ نشان ان کے چہرے پر کیوں بنایا گیا؟" محمود نے کہا۔

"نشان تو میرے چہرے پر بھی نظر آ رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آپ کے چہرے پر اس لیے بنایا گیا کہ آپ کا واسطہ اس نشان سے پڑ چکا تھا اور آپ یہ جان چکے تھے کہ ان نشانات کا مقصد کیا ہے..... اس لیے دشمنوں نے آپ کے چہرے پر بھی بنا دیا۔"

"ہوں..... خیر..... بہت جلد اصل بات معلوم ہو جائے گی، اب ہم کامیابی کے بہت نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ ہاں تو پروفیسر صاحب..... اب نشان بنانے کے لیے یہ زہر کسی انسان کے جسم میں کس طرح داخل کیا جاتا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ان کانٹوں کو پیس لیا جاتا ہے اور پھر انہیں سپرٹ میں حل کر لیا جاتا ہے، اب محلول کا ہزارواں حصہ بھی کسی انسان کے جسم میں داخل ہو جائے تو آنکھ کے نیچے پر نشان بن جاتا ہے۔"

"لیکن جسم میں داخل کیسے کیا جاتا ہے..... کیا اس کے لیے کسی نوک دار

چیز کی ضرورت پڑتی ہے؟"

"نوک دار چیز ضروری نہیں... ہاتھ کی پشت یا جسم کے کسی بھی حصے سے مس کر دینے سے بھی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"اوہ! اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اس نشان کے نمودار ہونے سے پہلے مجھ سے کس کس نے ہاتھ ملایا تھا... سب سے پہلے تو امجد رونق ہی آئے تھے، لیکن ان کا نام تو اب خارج کر دینا چاہیے، کیونکہ وہ بے چارے تو خود اس نشان کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان کے بعد پروفیسر رحمانی نے بھی مجھ سے ہاتھ ملایا تھا اور ان سے ہاتھ ملاتے وقت میری ہتھیلی پر خراش بھی آئی تھی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر انصاری بھی آئے تھے اور یہی وہ آدمی ہیں جنہوں نے یہ کہا تھا کہ ایسا نشان پڑنا ممکن ہے، کیونکہ وہ یہ ذکر کسی کتاب میں پڑھ چکے ہیں۔" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

"لیکن ابا جان... آپ کے جسم کو تو ہاتھ نقلی ڈاکٹر ناظر نے بھی لگایا تھا۔" فاروق نے کہا۔

"ہاں! یہ بات بھی سامنے رکھنی ہو گی اور اگر میرے چہرے پر نشان اس کے ہاتھ لگانے کی وجہ سے بنا ہے تو پھر مجھ سے ملاقات کرنے والوں میں سے کوئی بھی مجرم نہیں ہو سکتا۔ خیر ہم سوچیں گے۔ ابھی ہمارے پاس سوچنے کے لیے کافی وقت پڑا ہے، کیا تم

تینوں اپنی تیاریاں مکمل کر چکے ہو؟"

"جی ہاں... بس ذرا ان کا جائزہ لینا ہے کہ کہیں کوئی کسر تو نہیں رہ گئی۔" محمود نے کہا۔

"کیسی تیاریاں!" پروفیسر داؤد نے حیران ہو کر کہا۔

"کتے سے مقابلے کی تیاریاں... یہ تینوں اسے مجھ تک پہنچنے سے روکنے کی تیاریاں صبح سے کر رہے ہیں۔"

"لیکن یہ اسے کیسے روک سکیں گے... جب کہ وہ اتنی اونچی پھلانگ لگا سکتا ہے اور خود کو گولیوں سے بچا لیتا ہے۔" پروفیسر بولے۔

"یہ یہ جانیں، ان کا کام... میں نے ان سے تفصیلات نہیں پوچھیں، نہ انہیں کوئی مشورہ دیا ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"آج رات میں بھی یہیں رہوں گا۔ ایسے میں ہم تمہیں تنہا نہیں چھوڑیں گے۔"

"آپ کا مطلب ہے، میرے ساتھ اس کمرے میں رہیں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہاں!" پروفیسر نے تیز آواز میں کہا۔

"خان رحمان بھی یہی کہہ گئے ہیں۔ رات ہوتے ہی وہ بھی آ جائیں گے، لیکن میرا ایک مشورہ ہے، کم از کم آپ شائستہ کو گھر بھیج دیں۔"

"کیوں انکل! کیا میں بزدل ہوں۔" شائستہ نے بُرا مان کر کہا۔
"یہ بات نہیں بیٹی، وہ کتا بہت خوفناک اور بہت بڑا ہے۔"
"پروا نہیں!" اس نے اٹل لہجے میں کہا۔
"اچھا بھئی۔ جیسے تمہاری مرضی۔"
"ٹھیک تو ہے جمشید تمہارے کمرے میں خوب رونق رہے گی۔" پروفیسر بولے۔ "لیکن یہ خان رحمان واپس کیوں چلا گیا؟"
"وہ چار ضروری کام نبٹانے گئے تھے... شام تک واپس آجائیں گے۔" انہوں نے کہا۔
کمرے میں خاموشی چھا گئی، وہ سرخ نشان کے بارے میں سوچنے لگے۔

○

رات کا کھانا کھانے کے بعد انسپکٹر جمشید بستر میں لیٹ گئے، خان رحمان، پروفیسر داؤد اور بیگم جمشید ان کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چاروں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ خان رحمان کی جیب میں بھرا ہوا پستول تھا، پروفیسر داؤد اپنی تجربہ گاہ سے ایک ایٹمی شعاع والا پستول لے کر آئے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ اگر کتے کے جسم پر ایک شعاع بھی پڑ گئی تو وہ چُرمُر ہو جائے گا۔ خود انسپکٹر جمشید کے تکیے کے نیچے بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔

البتہ ان تینوں کو محمود، فاروق اور فرزانہ کی تیاریوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ وہ اس وقت اگرچہ گھر میں ہی موجود تھے، لیکن انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ تینوں دراصل اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھے اور اپنے پروگرام پر بحث میں مصروف تھے۔ آخر دس بجے کے قریب وہ اٹھ کھڑے ہوئے، کیونکہ کتے کے آنے میں صرف ایک گھنٹہ رہ گیا تھا، آخری مرتبہ انہوں نے نہایت خاموشی سے اپنے انتظامات کا جائزہ لیا اور پھر اپنے گھر کی چھت پر آ گئے۔ انہوں نے اپنی جیبوں سے پستول نکال کر داہنے ہاتھوں میں لے لیے اور تین سمتوں میں منہ کر کے بیٹھ گئے۔ ان تین ہی راستوں سے کتا مکان کی طرف بڑھ سکتا تھا۔
"اگر ان انتظامات کے بعد بھی کتا بچ گیا اور ابا جان کے کمرے تک پہنچ گیا تو کیا ہوگا۔" فرزانہ نے دھیمی آواز میں کہا۔
"ابا جان کوئی موم کی ناک نہیں ہیں اور پھر ان کا نشانہ کوئی معمولی نشانہ نہیں ہے۔" محمود نے کہا۔
"لیکن وہ زخمی ہیں۔" فرزانہ نے پُر زور لہجے میں کہا۔
"تو کیا ہوا، ان کا بایاں شانہ زخمی ہے، دائیں ہاتھ سے وہ بہت آسانی سے ریوالور چلا سکیں گے۔" فاروق بول اٹھا۔
"اور پھر کمرے میں پروفیسر انکل اور انکل رحمان بھی تو موجود ہیں، وہ بھی نہتے نہیں ہیں۔" فرزانہ نے کہا۔

"خیر! خدا نہ کرے کہ ایسی صورت سامنے آئے، ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ کتا ہمارے وار سے بچ نہیں سکے گا۔" محمود کا لہجہ یقینی تھا۔

"گویا آج ایک کتے کا اور ہمارا مقابلہ ہے۔" فاروق نے ہنس کر کہا۔

"ہمارا مقابلہ صرف ایک کتے سے نہیں، اس کتے کے پیچھے کسی بہت ہی شاطر اور خطرناک دشمن کا ہاتھ ہے۔" محمود بولا۔

"اس وقت تک اس کیس کا سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اس شخص کا مقصد کیا ہے۔ وہ چاہتا کیا ہے۔؟"

"پہلا مرحلہ کتے سے نبٹنے کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سیاہ پوش کا نہایت ہوشیاری سے تعاقب کیا جائے گا... اور اگر کسی وجہ سے ہمارے ساتھی ناکام رہے تو آج اس کا گھر دیکھ ہی لیا جائیگا۔ ایک بار وہ گرفتار ہو جائے، پھر یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہو گا کہ وہ کیا چاہتا تھا۔"

"ہوں.... خیر دیکھا جائے گا۔ میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ میری زندگی کا پہلا کیس ہے جس میں اتنے واقعات پیش آ جانے کے باوجود نہ ہم مجرم کو پہچان سکے ہیں اور نہ مقصد سمجھ میں آیا ہے۔" محمود نے کہا۔

"تو پھر یہ مان لو کہ تم عقل سے پیدل ہو چکے ہو۔" فاروق بولا۔

"تم مجھ سے پیچھے تھوڑا ہی ہو۔ میرے ساتھ ہی پیدل چل رہے ہو۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"اوہو! تو تمہیں بھی چوٹ کرنا آ گیا۔" فاروق نے چونک کر کہا۔

"نہیں تو...... میں نے تو تمہاری بات کا جواب دیا ہے۔" محمود مسکرایا۔

"اخباری رپورٹروں کو بھی تو شاید سن گن لگ گئی ہو گی اور وہ بھی آس پاس ہی کہیں موجود ہوں گے۔" فرزانہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

"تو پھر... ہمیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیا ان کے لیے ایک دلچسپ ترین خبر کی تیاری نہیں ہو چکی"!

"ہو تو چکی ہے، لیکن ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

ان کی باتیں جاری رہیں، وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ گیارہ بجنے میں صرف ایک منٹ رہ گیا، اسی وقت انہوں نے کالے رنگ کی کار کو گلی کا موڑ مڑتے دیکھا۔

"ہوشیار..... وہ آ گیا ہے۔"

محمود کے منہ سے نکلا۔ ساتھ ہی اس نے حلق سے اُلو کی آواز نکالی۔

وفادار

انسپکٹر جمشید نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بجنے میں صرف ایک منٹ باقی تھا۔ اسی وقت انہوں نے اُلّو کی آواز سُنی :

"اُلّو کی آواز سنی آپ لوگوں نے؟" انسپکٹر جمشید نے چونک کر کہا۔

"اُلّو..... لیکن یہاں اُلّو کہاں سے آ گیا؟" خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

"کیا آپ کے خیال میں ہمارے شہر میں اُلّو نہیں ہیں؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہاں! میرا تو خیال یہی ہے۔"

"اور اس کے باوجود اگر اُلّو کی آواز سنائی دی ہے تو پھر ہمیں چاہیے، ہم ہوشیار ہو جائیں، نہ صرف ہوشیار بلکہ تیار بھی۔" انہوں نے یہ کہتے ہوئے پستول تکیے کے نیچے سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

"کیا مطلب؟" خان رحمان اور پروفیسر داؤد چونکے۔

"مطلب یہ کہ تمہارا خیال ٹھیک ہے، شہر میں واقعی اُلّو

نہیں ہیں، یہ آواز تو دراصل محمود نے نکالی تھی۔"

"کیا!!" ان کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"ہاں! شاید کتے کا مالک کتے کو لے کر گلی تک پہنچ گیا ہے یہ آواز نکال کر انہوں نے ہمیں خبردار کیا ہے۔"

"اوہ!" وہ حیران رہ گئے۔

"خطرے کی صورت میں سب سے پہلے میں فائر کروں گا، جب تک میں فائر نہ کروں، آپ لوگ بھی فائر نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے۔" خان رحمان بولے۔

"اور اگر میرا نشانہ خطا ہو جائے تو پھر آپ دونوں کو ہر طرح چھٹی ہے، جو چاہیں کریں۔"

"کرنا کیا ہے، اپنے اپنے پستول سے فائر کریں گے۔"

عین اسی وقت انہوں نے ایک تین فائر ہونے کی آواز سُنی، وہ چونک اُٹھے۔ پستولوں والے ہاتھ سیدھے روشن دان کی طرف اُٹھ گئے، کیونکہ روشن دان کے سوا کوئی راستہ کتے کے اندر آنے کا نہیں تھا۔

ان کے اُوپر کے سانس اُوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے۔ نظریں روشن دان پر جم کر رہ گئیں۔ کوئی آن میں روشن دان میں وہ خوفناک کتا موت کا پیغام بن کر نظر آنے والا تھا۔

جونہی رومال سونگھنے کے بعد کتا مکان کی طرف آیا اور کار واپس مڑی، انہوں نے نشانہ لے کر ایک ساتھ فائر کر دیے، لیکن وہی ہوا جو اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ کتا دس گیارہ فٹ اچھل گیا۔ ادھر اس کے پیر زمین سے لگے، ادھر انہوں نے پھر فائر جھونک مارے اور یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کتا پھر اتنا ہی بلند اچھلا تھا اور ان میں سے ایک کی گولی بھی اس کے جسم میں نہیں لگی تھی۔۔۔ عجیب ترین بات یہ ہوئی کہ اس بار وہ ہوا میں ہی اچھلا اور ایک بیرونی کھڑکی کے چھجے پر چڑھ گیا۔ اب تینوں اس پر فائر نہیں کر سکتے تھے۔

"فاروق، فرزانہ چھت پر ہمارا کام ختم ہوا۔۔۔ اب ہم اس کا یہاں سے کچھ نہیں بگاڑ سکتے، نیچے چلو۔"

تینوں بجلی کی سی سرعت سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے پہنچے اور اپنے والد کے کمرے کی طرف دوڑے، عین اسی وقت انہوں نے ایک خوفناک غراہٹ سنی اور کتے کو تیر کی طرح کمرے کے روشن دان کی طرف آتے دیکھا۔۔۔ ان کے ہاتھ فائروں کے لیے اٹھے کے اٹھے رہ گئے۔ کتا روشن دان میں سے پلک جھپکتے میں گزر گیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ بدحواس ہو جاتے، ان کے رنگ اڑ جاتے، لیکن ہوا یہ کہ ان کے چہروں پر مسکراہٹیں پھیل گئیں جو ان کی کامیابی کا اعلان چیخ چیخ کر کرنے

لگیں۔ انہوں نے ایک دوسرے سے پرجوش انداز میں ہاتھ ملائے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ دوسرے ہی لمحے انہوں نے دروازے پر دستک دی۔

○

غراہٹ کی آواز انسپکٹر جمشید کے کانوں تک پہنچ گئی، انہوں نے فوراً اپنا پستول روشن دان کی طرف کر دیا اور بولے،

"ابھی کوئی فائر نہیں کرے گا!"

اور پھر ان کے منہ مارے حیرت کے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اتنا حیرت انگیز منظر نہیں دیکھا تھا، لیکن شاید انسپکٹر جمشید پہلے ہی کسی قدر اندازہ لگا چکے تھے کہ محمود، فاروق اور فرزانہ کتے کے پیچھے ہر قدم پر رکاوٹ کھڑی کریں گے اور آخری رکاوٹ روشن دان میں ہوگی کیونکہ وہ انہیں بتا چکے تھے کہ کتا روشن دان سے اندر آئے گا۔

عین اسی وقت انہوں نے دستک کی آواز سنی:

"بیگم دروازہ کھول دو، وہ تینوں آ گئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے کمرے میں مسلسل کتے کی غراہٹیں گونج رہی تھیں۔ بیگم جمشید نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ تینوں اندر داخل ہوئے اور مسکرا کر روشن دان کی طرف دیکھا۔

کتا نائیلون کے باریک دھاگوں سے بنے ہوئے ایک جال میں لٹک رہا تھا۔ بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا، اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ تینوں نے اسے دیکھا اور کانپ کر رہ گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اتنا خوفناک اور بڑا کتا آج تک نہیں دیکھا تھا۔

"تم تینوں مبارک باد کے مستحق ہو۔ تمہارا یہ کارنامہ سنہری لفظوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔" خان رحمان نے بے اختیار بچوں کی طرح تالیاں بجا دیں، ابھی نہیں ان تالیوں میں پروفیسر داؤد کی بھی شامل ہو گئیں۔ انسپکٹر جمشید اور بیگم جمشید کے چہروں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹیں رینگ گئیں۔ پھر انسپکٹر جمشید کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

"ابھی ہمارا اصل کام باقی ہے۔ کتا قابو میں آ چکا ہے۔ کار والے کا تعاقب شروع ہو چکا ہو گا... چند منٹوں میں اس کے گھر کا پتا لگنے والا ہے، ہم وہاں جائیں گے اور اسے گرفتار کر لیں گے۔"

"تو کیا.... وہی اصل مجرم ہے۔"

"ہاں! لیکن اس نے یہ کام دشمن ملک کے اشارہ پر کیا ہے، وہ اس ملک کا ایجنٹ ہے۔" انہوں نے کہا۔

"اوہ! لیکن آخر اس کا مقصد کیا تھا؟" فاروق نے پوچھا۔

"مقصد بھی بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ ویسے تھوڑا بہت

تو مجھے اندازہ ہے، خیر پہلے تو ہم اس پر ہاتھ ڈالیں گے، مقصد تو بعد میں معلوم کرتے رہیں گے... آؤ... چلیں۔"

"لیکن ابھی یہ اطلاع کہاں آئی ہے کہ تعاقب کامیابی سے کیا گیا ہے اور کار والے کا گھر دیکھ لیا گیا ہے۔"

"اتنے میں ہم باہر نکلیں گے، اطلاع بھی آ جائے گی۔" انہوں نے کہا۔

اور پھر سب باہر نکل آئے۔ پروفیسر داؤد اور بیگم جمشید کو گھر میں ہی رہنے دیا گیا۔ عین اسی وقت ایک جیپ ان کے دروازے پر آ کر رکی... اس میں سے اکرام چھلانگ لگا کر اترا:

"خدا کا شکر ہے کہ آپ بخیریت ہیں، کتے کا کیا بنا؟"

"وہ بعد میں آ کر دیکھنا... تعاقب کی سناؤ۔"

"اس کے گھر تک تعاقب کیا گیا ہے اور اب گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا... کوئی پرندہ بھی اس گھر سے ہماری نظر بچا کر نہیں نکل سکتا۔"

"بہت خوب! تو پھر چلو! ہم پہلے ہی تیار ہیں۔"

"آئیے!" اس نے کہا اور جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

صرف چار منٹ بعد وہ اس کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے جسے چاروں طرف سے گھیرے میں لیا جا چکا تھا۔ اس کا دروازہ اندر سے بند تھا اور کسی کے نام کی تختی نہیں لگی تھی۔

"فاروق! میں اندر بہت خاموشی سے داخل ہونا چاہتا ہوں۔"

"جی بہت بہتر، میں کسی پائپ کے ذریعے اوپر جاتا ہوں اور اندر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"خیال رہے... کوئی آہٹ نہ ہونے پائے۔" انہوں نے کہا۔

"فکر نہ کریں۔" فاروق بولا اور کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف چل پڑا۔ چند منٹ بعد کوٹھی کا دروازہ کھل گیا اور فاروق کی سرگوشی سنائی دی:

"آجائیے!"

وہ اندر داخل ہوئے۔ انسپکٹر جمشید نے صرف اکرام کو ساتھ لیا تھا، باقی پولیس والے باہر ہی ٹھہرے تھے۔ دبے پاؤں چلتے ہوئے وہ برآمدے میں آئے۔ ایک کمرے کے شیشوں سے روشنی جھانک رہی تھی... کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ البتہ پٹ ضرور بند تھے، لیکن درمیان میں ایک روشنی کی لمبی لکیر سے انہوں نے جان لیا، ایک ٹھوکر دروازے کو کھول دے گی۔ وہ آگے بڑھے۔ انسپکٹر جمشید نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔

دروازے کی جھری بڑی ہو گئی۔ کمرے میں دو آدمی تھے اور دونوں کی کمریں دروازے کی طرف تھیں۔ وہ ایک لوہے کی الماری کھولے کھڑے تھے۔ ان میں اونچے قد والا سیاہ کپڑے پہنے ہوئے تھا۔

اور ہیلو... جانی... ہیلو جانی کہہ رہا تھا۔

انسپکٹر جمشید نے ریوالور جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔ محمود، فاروق، فرزانہ اور اکرام بھی ان کے پیچھے قدم اٹھانے لگے۔ اسی وقت انہوں نے سیاہ لباس والے کو کہتے سنا:

"ہیلو جانی! تم یہ سن کر خوش ہو گے کہ آج میں نے وہ کام انجام دے ڈالا ہے جو تم نے میرے ذمے لگایا تھا اور جسے کرنے سے انور کریم اور امجد رؤف نے انکار کر دیا تھا۔ میں نے تمہارے حکم کے مطابق پہلے انہیں ختم کیا... کیونکہ انکار کر کے وہ ہمارے ملک سے غداری کا جرم کر چکے تھے، لہٰذا پہلے ان دونوں کو ختم کرنا ضروری تھا اور اس کے بعد اصل حکم پر عمل کیا، یعنی انسپکٹر جمشید کا خاتمہ... میں اس کے گھر کتا چھوڑ آیا ہوں... ہاں... تم جانتے ہی ہو کتے کا وار خالی نہیں جا سکتا، اوّل تو وہ ہے ہی بہت خوفناک نسل کا کتا، دوسرے میں اپنے ملک کے سائنس والوں کا تیار کردہ محلول اسے پلا دیتا ہوں، وہ محلول جو رگوں میں آگ بھر دیتا ہے اور بجلی دوڑا دیتا ہے... بس صبح کے اخبارات میں انسپکٹر جمشید کی گردن ادھڑی ہوئی نظر آئے گی... اب مجھے دشمن ملک میں کب تک رہنا ہو گا... تم تو وہاں اپنے وطن میں مزے سے رہتے ہو... کیا کہا... جب ہمارا اس ملک پر قبضہ ہو گا... اس وقت ہمیں عالیشان عہدے

ملیں گے، وہ دن جب آئے گا، دیکھا جائے گا۔ اچھا ٹھیک ہے، کل پھر تفصیل سے بتاؤں گا کہ شہر میں انسپکٹر جمشید کی موت کے بعد کیسا نظارا دیکھنے میں آیا... اوکے۔"

کلک کی آواز آئی، سیاہ پوش نے الماری بند کی اور دروازے کی طرف مڑا اور اس بری طرح اچھل کر الماری سے ٹکرا گیا، اس کے ساتھی کا بھی یہی حال ہوا... وہ اس طرح انسپکٹر جمشید کو دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی بھوت ہوں۔ دوسری طرف وہ بھی سیاہ لباس والے کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔

"تو انور کریم اور امجد رؤف بھی غیر ملکی جاسوس تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا... اور تم ہمارے ملک پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہے ہو... لیکن جب تک اس سرزمین پر وطن سے پیار کرنے والے، اس کے ایک ایک ذرے کے لیے اپنا خون نچھاور کرنے والے اور اپنا تن من دھن قربان کرنے والے زندہ ہیں، تمہارا خواب کبھی پورا نہیں ہو گا اور پروفیسر رحمانی... تمہارا خواب تو ابھی چکنا چور ہو گیا ہے... تم سوچ رہے ہو گے، کتا کہاں گیا... ہم تمہیں اس کا انجام بھی دکھائیں گے... تم اسے ناقابلِ تسخیر خیال کرتے تھے، لیکن عقل سے زیادہ طاقت ور چیز آج تک دنیا میں کوئی ثابت نہیں ہوئی... اور تمہارے کتے کو میرے تینوں بچوں نے ہاتھ

لگائے بغیر قابو کر لیا ہے... ہم اسے اپنے چڑیا گھر کو بطور تحفہ پیش کریں گے... اور اس کے گلے میں پٹا ڈالا ہو گا... اس پٹے پر یہ ہم لکھوائیں گے... پروفیسر رحمانی کا خونی کتا... جو دشمن ملک کا جاسوس تھا؟"

انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔ اکرام نے سیٹی بجا دی اور پولیس والوں نے ان دونوں کو چھاپ لیا... دوسرا آدمی تابانی تھا...

"چلو بھئی... ذرا انہیں کتے سے بھی ملوا دیں... کیونکہ یہ ان کی آخری ملاقات ہو گی۔ اس کے بعد کتا اپنے مالک کو کبھی نہ دیکھ سکے گا۔" فاروق نے جیپ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا: "ویسے مجھے کتے سے زیادہ اس شخص پر زیادہ ترس آ رہا ہے۔ کتے نے اس سے بے وفائی نہیں کی، لیکن یہ اپنے ملک کا وفادار نہیں تھا۔ یار محمود... کیا کتا انسان سے بھی زیادہ وفادار ہے؟"

وہ اس کی باتوں پر مسکراتے رہ گئے۔ کیونکہ اس نے آج مزاحیہ جملہ نہیں بولا، یہ تو بہت زبردست کڑوی بات تھی۔

مراد، ریٹائرڈ انسپکٹر رضوی اور موتی کے کارنامے
بچوں کے مشہور مصنف ستار طاہر
ہر ماہ دو ناول
(۳) خطرناک راہیں
(۴) انصاف کا دن